دینی | اصلاحی | فکری | علمی

خصوصی شمارہ

مسجدِ اقصیٰ اور شہرِ قدس تاریخی حقائق اور بازیابی کی تدابیر

ماہنامہ

شاہراہِ علم

جامعہ کا پیغام ملّتِ اسلامیہ کے نام

جمادی الاوّل، جمادی الآخر ۱۴۳۹ھ، فروری، مارچ ۲۰۱۸ء

اللھم حرر الأقصیٰ!

اے اللہ: اقصیٰ کو آزاد فرما۔

یا اللہ! مسجدِ اقصیٰ کو آزاد فرما کر ہمارے قلوب کی ٹھنڈک کا سامان پیدا فرما۔

اے اللہ: موت سے پہلے بیت المقدس میں نماز ادا کرنا مقدر فرما۔

اے الٰہ العالمین: ہمارے فلسطینی مسلم بھائیوں کی مدد فرما۔

اے بارِ الٰہا: ان کی آل واولاد کی حفاظت فرما اور ان کے جان ومال کو اپنی حفاظت میں لے لے۔

یا ارحم الراحمین: گم شدہ بھائیوں کو ان کے وطن لوٹا دیجیے اور ان کو اپنے دیار میں خوش وخرم بسا دیجیے۔

اے خداوندِ عالم: ان کے کم زوروں پر رحم فرما، ان کے ٹوٹے دلوں کو جوڑ دے اور ان کے عزائم کو تقویت عطا فرما۔

اے مولائے کریم: ان کی صفوں میں اتحاد پیدا فرما، ان تمام کو کلمۂ حق پر جمع فرما اور ان کی آرا کو درست فرما۔

اے اللہ: ان کے دشمنوں میں پھوٹ ڈال دے اور ان کو شدید آپسی اختلاف وانتشار میں مبتلا کر دے۔

یا مقلبَ الاحوال: اِس امت کے لیے ایک ایسا خدا ترس قائد مہیا فرما، جو ہر سو اعلاء کلمۃ اللہ کی بہار لادے۔

اے میرے مولا: سرزمینِ فلسطین پر کتاب وسنت کی تنفیذ ہو، ایسے اسباب غیب سے مہیا فرما۔

اے ربِ کریم: مسجد اقصیٰ کو ناپاک یہودیوں اور ہر ظالم وجابر سے نجات عطا فرما۔

زیرِ سرپرستی

حضرت مولانا غلام محمد صاحب وستانوی مدظلہ العالی

مدیر

حذیفہ مولانا غلام محمد صاحب وستانوی

جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا، نندوربار، مہاراشٹر ۴۲۵۴۱۵

1

Per Copy Rs.

Printed Matter

Feb., March 2018

وَ قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا (طٰہٰ)

ماہنامہ

''شاہراہِ علم''

''مسجد اقصیٰ اور شہر قدس'' تاریخی حقائق اور بازیابی کی تدابیر

(جامعہ کا پیغام ملتِ اسلامیہ کے نام)

زیرِ سرپرستی

حضرت مولانا غلام محمد صاحب وستانوی مدظلہ العالی

مدیر: حذیفہ مولانا غلام محمد وستانوی

جلد نمبر : ۷ شمارہ نمبر: ۲-۳

ماہ : جمادی الاولیٰ، الاخریٰ ۱۴۳۹ھ فروری، مارچ ۲۰۱۸ء

زرِ تعاون: سالانہ ۲۰۰ روپے سادہ ڈاک / رجسٹری ۳۵۰ روپے

ترسیل زر کا پتہ

''دفترِ شاہراہِ علم''

جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا، ضلع نندوربار، مہاراشٹر، ۴۲۵۴۱۵

فہرست مضامین

نوٹ: ماہنامہ ''شاہراہ علم'' مدیر وایڈیٹر مولانا محمد حذیفہ غلام محمد وستانوی صاحب رندیرا'' جامعہ کوارٹر جامعہ نگر اکل کوا''
نے ہمدم پریس مالیگاؤں سے طبع کروا کر دفترِ شاہراہ علم سے شائع کیا۔

..... کمپوزنگ وسیٹنگ: محمد سبحان ارریاوی اشاعتی .....

فہرست مضامین



اداریہ:

قضیہ فلسطین اور مسلمانانِ عالم کی ذمہ داریاں

مولانا حذیفہ ابن مولانا غلام محمد صاحب وستانوی

انسان جو بھی نیکی یا کارِ خیر کرتا ہے، وہ محض توفیق ایزدی سے کرتا ہے۔ وماتوفیقی الا باللہ؛ جامعہ اکل کوا کا ترجمان ''شاہراہ علم'' کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی ہے کہ وہ امت کو سلگتے ہوئے مسائل سے واقف کرائے، اسی غرض سے دسیوں خصوصی شمارے بارہ سال کے عرصے میں الحمدللہ! منظرِ عام پر آکر شرفِ قبولیت پا چکے ہیں۔ آغاز سے اب تک کے موقع بہ موقع شائع شدہ خصوصی شمارے یہ ہیں:

مجلّہ ہذا کے خصوصی شمارے:

شمار	شاہراہِ علم کے خصوصی شمارے	سن طباعت
۱	''فرقِ باطلہ نمبر''	رجب المرجب- رمضان ۱۴۲۶ھ (۳۰ رسے زائد فرقوں کا تعارف))
۲	دفاعِ حبیبِ کبریا صلی اللہ علیہ وسلم''	محرم- ربیع الاول ۱۴۲۷ھ (کارٹون کے موقع پر اس کے رد میں)
۳	''طالبانِ علومِ نبوت اور عصری تقاضے''	شوال- ذی الحجہ ۱۴۲۷ھ (طلبہ کی رہنمائی کے لیے)
۴	''اسلام اور سائنس راہِ اعتدال''	محرم- ربیع الاول ۱۴۲۸ھ (سیکولرزم اور سائنس کی تاریخ)
۵	''جامعہ نمبر''	رجب المرجب- رمضان ۱۴۲۸ھ (جامعہ کی خدمات)
۶	''فقہ المناسبات نمبر''	ربیع الثانی- رمضان ۱۴۲۹ھ (مغربی کلچر کے ڈیز کے احکام)
۷	''تعارف العلوم''	محرم- جمادی الاخریٰ ۱۴۳۰ھ (۳۰ رسے زائد علوم کا تعارف)
۸	''رمضان نمبر''	رجب المرجب- رمضان ۱۴۳۲ھ (رمضان میں رہنمائی)
۹	''تحفظِ ناموسِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم''	ذی الحجہ ۱۴۳۳ھ- نومبر ۲۰۱۲ء (آپ کی دفاع میں)
۱۰	''علم سیرت ایک تعارف''	ربیع الاول ۱۴۳۵ھ- جنوری ۲۰۱۴ء (علومِ سیرت کا تعارف)
۱۱	''سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم''	ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ- فروری ۲۰۱۴ء (دلفریب اسلوب میں کردارِ نبوی)
۱۲	''حالاتِ حضرت مہدیؓ اور علامات قیامت''	ربیع الآخر ۱۴۳۵ھ- مارچ ۲۰۱۴ء (مہدویت کے دعویداروں کا بطلان)
۱۳	''سیاست، جمہوریت، ووٹ اور اسلام''	رجب المرجب ۱۴۳۵ھ- مئی ۲۰۱۴ء (اسلام کا نظریہ سیاست اور ووٹ کا حکم)

۱۴	''عصر حاضر کے سلگتے فتنے اور مسلمانوں کے لیے لائحہ عمل''	شعبان، رمضان ۱۴۳۶ھ- جون، جولائی ۲۰۱۵ء (موجودہ فتنوں کی حقیقت)
۱۵	''رابطۂ ادب اسلامی کے ۳۵/ویں مذاکرۂ علمی کی روداد''	صفر، ربیع الاول ۱۴۳۷ھ- دسمبر ۲۰۱۵ء (رابطہ ادبِ اسلامی کے سیمینار پر)
۱۶	''تفہیم اسلام عصر حاضر کے تناظر میں''	رمضان-ذیقعدہ ۱۴۳۷ھ، جون-اگست ۲۰۱۶ء (عصری اسلوب میں اسلام کا تعارف)
۱۷	''مسلم پرسنل لا بورڈ کا تحفظ''	صفر المظفر ۱۴۳۸ھ-نومبر ۲۰۱۶ء (یکساں سول کوڈ کے رد میں)
۱۸	''خصوصی شمارہ''	شعبان-شوال ۱۴۳۸ھ، مئی- جولائی ۲۰۱۷ء (رمضان سے متعلق)
۱۹	''خصوصی شمارہ بر تذکرہ حضرت شیخ جون پوریؒ''	ذی الحجہ ۱۴۳۸ھ- ستمبر ۲۰۱۷ء (بر وفاتِ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ)

قضیۂ فلسطین — ایک عقیدے پر ثابت قدمی کا تقاضا

قضیۂ فلسطین پر ایک مزید خصوصی پیشکش:

اِس وقت امت کو جو مسئلہ درپیش ہے وہ مسئلہ ''فلسطین اور بیت المقدس'' ہے۔ امریکی حکومت کی جانب سے فلسطین کے شہر ''القدس'' کو اسرائیل کی راجدھانی قرار دینے کے اعلان کے بعد سے یہ مسئلہ موضوعِ بحث بنا ہوا ہے۔ کتاب وسنت نیز تاریخی حیثیت اور مسلمانوں کی اکثریت کے رجحان کے اعتبار سے فلسطین اور القدس شہر مسلمانوں کا ہے اور رہے گا۔ ان شاء اللہ!

تو آیئے! اس سلسلہ میں مستند اور معتبر معلومات کو آپ حضرات کی خدمت میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح اسلامی موقف کو واضح کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور عقائدِ اسلامیہ اور فکرِ اسلامی کے بابت ہر طرح کی ضلالت اور گمراہی سے ہماری حفاظت فرمائے۔

احقر ایک منفرد اسلوب میں کچھ قلمبند کرنے کی جرأت کر رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ بیت المقدس حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں ہمارے قبضہ میں آیا، اس کے بعد تقریباً چار صدیوں تک ہمارے پاس رہا؛ پھر تقریباً ۹۰/سال کے لیے ہمارے ہاتھ سے جاتا رہا، اور پھر دوبارہ ہمارے قبضے میں آیا اور الحمد للہ! تقریباً ۹۰۰/سال ہمارے زیرِ نگیں رہا اور پھر تقریباً ۶۹/سال قبل ہمارے قبضے سے جاتا رہا۔ میں نے تاریخ کی ورق گردانی کرکے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ پانچویں صدی ہجری میں کن اسباب کی بنیاد پر القدس ہمارے ہاتھوں سے گیا اور پھر ۹۰/سال بعد کیسے ہمارے قبضہ میں آیا، اس کے ظاہری اسباب سے زیادہ باطنی اسباب کیا رہے ہیں؟ کن علمی شخصیات کی خدمات کی وجہ سے صلاح الدین ایوبی جیسی نسل پیدا ہوئی اور کس طرح اس پر دوبارہ قبضہ کیا گیا؛ اس کے بعد دوسری مرتبہ کیسے ہمارے ہاتھوں سے چلا گیا اور اب اسے دوبارہ حاصل کرنے کے لیے کیا کیا جانا چاہیے۔

اللهم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه. اللهم وفقنا بالقول والنية والفعل والعمل لما تحب و ترضى.

اپنے عقیدے پر ثابت قدمی بقائے امت کا راز:

کسی بھی امت کا سب سے اہم ترین اور ترجیحی اور اولیت کا حامل مسئلہ اس کا اپنا تشخص ہوتا ہے، جس کی جانب قرآنِ کریم نے بھی اشارہ کیا ہے۔ ﴿وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ﴾ اے مسلمانو! تم ہی سر بلند رہو گے بشرطیکہ تم صفت ایمان سے متصف رہو۔

مسئلہ فلسطین کا تعلق ہمارے عقیدے سے ہے۔ لہٰذا اس کی تاریخ اور کتاب وسنت میں اس کے مقام اور حیثیت کو جاننے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ اس کے حصولیابی کی کیا صورت ہوگی، وہ ہمارے ہاتھوں سے کیوں چلا گیا؟ اور اس کے اسباب کیا رہے؟ تو آیئے پہلے اس پر روشنی ڈالتے ہیں۔

فکری وسلاحی جنگ کے اثرات:

اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا میں انسانوں کے درمیان جو معرکہ آرائی ہو رہی ہے؛ وہ دو طرح کی ہے، ایک اسلحہ کے ذریعہ اور دوسری سازشوں کے ذریعے۔ ہمیشہ اسلحہ کی جنگ سے پہلے فکری جنگ ہوتی ہے اور پھر جو فکری یلغار میں کامیاب ہوتا ہے وہ اسلحہ کی جنگ میں بہ آسانی کامیاب ہو جاتا ہے۔ پوری انسانی تاریخ اس پر گواہ ہے، جس پر تفصیل سے روشنی ڈالنے کا ابھی موقع نہیں ہے (احقر اپنے متعدد اداریوں اور مضامین میں تفصیل کے ساتھ اس پر الحمد للہ! اللہ کی توفیق اور فضل خاص سے کافی لکھ چکا ہے، جس کے لیے مندرجہ ذیل اداریے اور مضامین کی طرف مراجعت مفید ہوگی۔)

پرفتن دور میں امتِ مسلمہ کی رہنمائی کے لیے لکھے گئے اداریے:

شمار	عناوین
۱	موجودہ اور آئندہ نسلوں کو الحاد و بے دینی سے کیسے بچایا جائے؟
۲	الغزو الفکری: تعارف و تجزیہ
۳	تعلیم اور سماجی خرابیاں
۴	امت کی پستی اور بگاڑ کے اسباب اور اس کا صحیح حل اور علاج
۵	دنیا کی سیاسی، معاشی، اخلاقی ابتری کے اسباب اور اس کا حل
۶	امت ہمہ جہتی مصائب سے کیسے نجات حاصل کر سکتی ہے؟
۷	فتنوں کے دور میں ایمان کو کیسے بچایا جائے؟
۸	عصر حاضر کے مادی افکار و نظریات، شریعت اسلامیہ کی کسوٹی پر
۹	اسباب نصرت و ہزیمت سیرت کی روشنی میں مع برکات نبوت

۱۰	ظالم حکمرانوں کے تسلط کے ظاہری وروحانی اسباب اور اس سے نجات کا راستہ یعنی (سیاست، ریاست، حکومت، جمہوریت اور ووٹ کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر مع اسباب تدارک)
۱۱	فتنے سے کیوں اور کیسے بچیں؟
۱۲	مسلمان پر آشوب حالات سے کیسے نجات حاصل کر سکتے ہیں؟
۱۳	سسکتی انسانیت کو اسلام کی معتدلانہ تعلیم کی ضرورت
۱۴	مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے اور ان کی تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں ائمہ مساجد کا روشن کردار!
۱۵	یکساں سول کوڈ نہ شرعاً قابلِ نفاذ نہ دستورِ ہند کے اعتبار سے

البتہ یہ ضرور بتایا جائے گا کہ ہم اس وقت جس سیاسی کمزوری کا شکار ہیں، اس سے پہلے ہم کس فکری معرکہ سے دوچار ہوئے، جس کے نتیجے میں دشمن نے ہمیں ایمانی اعتبار سے کمزور کیا۔ اور آخر کار ہم سیاسی ضعف کا شکار ہو گئے۔

مسلمانوں کے سیاسی زوال کا آغاز:

مؤرخین اور تجزیہ نگاروں کا بیان ہے کہ مسلمانوں کے سیاسی زوال کا آغاز دراصل ۱۶۹۹ء سے شروع ہوا، اور اس کے چند تاریخی عوامل مندرجہ ذیل ہے:

1699: معاہدہ کارلووٹز (Treaty of Marlowitz) خلافت عثمانیہ کے زوال کا آغاز۔

1707: اورنگ زیب عالمگیر کی وفات۔ ترکش مارا خدنگ آخریں کا خاتمہ۔

1716: پیٹرووراڈن (Petrovaradin) یوگوسلادیہ میں ترک فوجوں کو شکست۔

1717: خیوہ پر روس کا قبضہ، بلغراد ترکوں کے ہاتھوں سے نکل گیا۔

1739: دہلی پر نادر شاہ کا حملہ، دہلی میں قتل عام، مرہٹا قوت کا عروج جس نے سلاطینِ دہلی کو کٹھ پتلی بنا کر رکھ دیا۔

1751: آرکاٹ پر کلایو (Clive) کا قبضہ، جنوبی ہند کے بعض علاقوں پر فرانسیسی ڈپلیکس (Dupliex) کا قبضہ، چین کا تبت اور اقصیٰ چین پر قبضہ۔

1757: پلاسی کی جنگ، سراج الدولہ کی شہادت۔

1765: بنگال کی دیوانی پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا قبضہ۔

1774: وارن ہسٹینگز پہلا گورنر جنرل مقرر ہوا، خلافتِ عثمانیہ کو شکست، معاہدہ کوچک کیناری (Treat y of Kutchak Kainarji) کے تحت روس کے تغلب کو تسلیم کر لیا گیا۔

مسلمانوں کے سیاسی زوال کا آغاز:

1798: نپولین بوناپارڈ کی سربراہی میں کوکبی مقتدرہ یعنی یہودیوں کا فلسطین پر قبضہ کے لیے مصر پر حملہ اور قبضہ۔

1799: سرنگاپٹم کی جنگ، سلطان ٹیپو کی شہادت۔

1770-99: برطانوی سلطنت کے ذریعہ آستانۂ عالیہ اور خلافتِ عثمانیہ کو کھوکھلا کرنے کے لیے خلیج فارس کے عرب قبائلی سرداروں کے ساتھ ساز باز اور معاہدے اور جزیرۃ العرب میں عظیم سازش کا آغاز۔

1804: دہلی پر براہِ راست برطانوی قبضہ۔

1830: الجزائر پر فرانس کا قبضہ۔

1801-31: شمال مغربی ہندوستان میں سکھوں کا عروج، مسلمانوں کی منصوبہ بند تباہی اور ان پر مظالم۔

1831: سانحہ بالاکوٹ، سید احمد اور مولانا اسماعیل دہلویؒ کی شہادت۔

1831: معاہدۂ کوتاہیہ، خلافت عثمانیہ کا پہلا باضابطہ بکھراؤ۔ محمد علی کو مصر اور شام کا والی تسلیم کر لینا۔

1773-1880: ہندوستان کے طول و عرض میں نظامِ اراضی سے مسلمانوں کی بے دخلی۔ فرائضی تحریک۔

1770-1880: حبہ صیہون (Hibbetzion) تحریک کا آغاز، کوکبی مقتدرہ کی فلسطین پر قبضہ کی عالمی سازش کا آغاز۔

1857: سلطنتِ مغلیہ کا خاتمہ کرنے کی برطانوی سازش کا آغاز۔

1858: بے جہت اور غیر منصوبہ بند شورش کی ناکامی، پورے ہندوستان میں بالعموم اور دہلی میں بالخصوص مسلمانوں کا قتلِ عام اور پھانسی، سلطنتِ مغلیہ کا خاتمہ، ہندوستان میں براہ راست برطانوی سلطنت کا قیام۔

1876: خلافتِ عثمانیہ اور بابِ عالی میں کوکبی مقتدرہ کی عظیم کامیابی۔ تنظیمات کے دوسرے مرحلے کا آغاز، پارلیامنٹ کا قیام۔ وکٹوریہ کے ہندوستان کی "ملکہ" ہونے کا اعلان۔ ہندوستان میں داخلی ملی اور قومی کش مکش کی برطانوی پالیسی کا آغاز، بلقان جنگوں اور ان میں ترکی کی شکست کا آغاز۔

1897: یونان ترکی جنگ، ملکہ وکٹوریہ کا جشن زریں۔ قیام اسرائیل کے لیے پہلی صیہونی کانفرنس کا باسل میں انعقاد۔

1900: کانم اور چاڈ پر برطانوی قبضہ۔

1901-03: نائجیریا پر برطانوی قبضہ۔

1904: سائکس، پیکو خفیہ معاہدہ (Sykes-picot Agreement) کوکبی مقتدرہ کی برطانیہ، روس اور فرانس کے ساتھ مل کر خلافتِ عثمانیہ کے خلاف جنگ کرنے اور شکست دینے کے بعد خلافتِ عثمانیہ کے خاتمہ اور اس کے بندر بانٹ کی خفیہ سازش۔ دوسری عالیہ (Second Aliyyah) 1904-14 کا آغاز۔

1908: کوکبی مقتدرہ کی عظیم منصوبہ بندی کے تحت ترکی میں نوجوان ترکوں (Turks Young) کے نام سے خفیہ تنظیم کا قیام۔ بوسینا، ہرزے گووینا سے ترکی اقتدار ختم۔ ترکی میں مشروطیت کا آغاز۔

1909: خلیفہ عبدالحمید الثانی کی معزولی۔(۱)

1913: یورپی علاقے میں خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کا آغاز۔

1916: فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام کے برطانوی عزم کا اعلان، بالفور اعلانیہ۔

1918: خلافتِ عثمانیہ کی جنگ عظیم میں شکست، پہلی جنگ عظیم کا خاتمہ۔

1923: خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ، امت مسلمہ محمدیہ میں خلافت کا خاتمہ، ترکی جمہوریہ قرار پایا، خلافتِ عثمانیہ کی بندربانٹ۔ (امت کا بحران/ اسرار عالم صاحب، ص ۳۰ تا ۳۵)

مسلمانوں کے عروج کے لیے ایمان میں پختگی ضروری ہے:

علمائے راسخین کی بڑی جماعت کا رجحان اس جانب ہے کہ مسلمانوں کے لیے نصرتِ الٰہی کا مدار قوتِ ایمانی پر ہے؛ اسی لیے اگر قرآنِ کریم کی آیتوں پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے اپنی مدد کو ایمانِ حقیقی کے ساتھ مشروط کیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے: ﴿وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ کہ تم ہی سربلند رہوگے، بشرطیکہ تم مومن رہو۔ تو معلوم ہوا کہ سربلندی کے لیے ایمان شرط ہے۔ اور ایمان کہتے ہیں اسلامی عقیدہ کا مضبوطی کے ساتھ دل میں جم جانا جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے: ﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا، قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾

ترجمہ: یہ دیہاتی کہتے ہیں کہ: ”ہم ایمان لے آئے ہیں۔“ ان سے کہو کہ: ”تم ایمان تو نہیں لائے، البتہ یہ کہو کہ ہم نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ اور ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔

---

(۱) سلطان عبدالحمید الثانی دولۃ عثمانیہ کے ۳۴ رویں سلطان تھے اور آلِ عثمان کے ۲۶ رویں خلیفہ تھے، گویا خلافت اور سلطنت دونوں ان کو میسر ہوئی، انتہائی زیرک ذہین جرأت مند دور اندیش تھے، عیسائیوں اور یہودیوں نے مل کر اتحادیوں کے سہارے ۲۷ راپریل بروز منگل ۱۹۰۹ء کو خلافت سے معزول کر دیا سلطان نے اپنی فراست کی وجہ سے خلافت کو تقریباً ۳۴ رسال کی زندگی ملی، سلطان کی ولادت ۲۱ ر ستمبر ۱۸۴۲ء میں ہوئی اور ۳۱ ر اگست ۱۸۷۶ء کو آپ منصب خلافت پر فائز ہوئے۔ ۳۳ رسال آپ خلیفہ رہے، ۲۸ ر ربیع الآخر ۱۳۳۶ مطابق ۱۵ رفروری ۱۹۱۸ ر کو ۷۶ رسال کی عمر میں وفات پائی۔

آپ کو امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین اور خادم الحرمین الشریفین کے القاب سے یاد کیا جاتا تھا اور آپ اسلامی تاریخ کے ۱۰۲ ر ویں خلیفہ تھے، جس دن آپ کا انتقال ہوا یہود نے عید منائی اور اپنے اخبارات میں اعلان کیا کہ اب اسرائیلی ریاست قائم ہو جائے گی! اس سے ان کی دینی حمیت اور طاقت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ آپ کے آخری کلمات یہ تھے: ”اللہ گواہ اور شاہد ہے کہ میں نے اپنے دور کے ۳۳ رسالہ عرصے میں سوائے دین کی خدمت و راس کی سربلندی کے علاوہ کوئی کام یا فیصلہ نہیں کیا اور میری ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ تمام ترکیوں اور تمام مسلمانوں کی زندگی کا مقصد اپنے دین کی حفاظت کے علاوہ کچھ نہ ہو“ اللہ ان کی قبر کو نور سے بھر دے اور امت کی جانب سے اجرِ عظیم سے نوازے۔

دیہات کے کچھ لوگ دِل سے ایمان لائے بغیر ظاہری طور پر کلمہ پڑھ کر اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر رہے تھے، جس کا مقصد مسلمانوں جیسے حقوق حاصل کرنا تھا۔ مدینہ منورہ میں آکر انہوں نے راستوں پر گندگی بھی پھیلائی تھی۔ ان آیات میں ان کی حقیقت واضح فرمائی گئی ہے اور یہ واضح کردیا گیا ہے کہ سچا مسلمان ہونے کے لیے صرف کلمہ پڑھ لینا کافی نہیں ہے، بل کہ دِل سے اسلامی عقائد کو ماننا اور اپنے آپ کو اِسلامی اَحکام کا پابند بنانا ضروری ہے۔ (آسان ترجمۂ قرآن،ص ۱۵۸۶)

اسی طرح ایک اور جگہ ارشاد ربانی ہے: ﴿وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ کہ مومنین کی نصرت ہم پر بمنزلہ فرض کے ہے۔ اللہ اکبر! یہاں بھی ایمان کا مطالبہ ہے۔

اللہ کی غیرت کبھی بھی مومنین کو تنہا اور اکیلا نہیں چھوڑتی، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَا اَنْتُمْ عَلَيْهِ﴾

اس کے علاوہ بھی متعدد مقامات پر نصرت، عزت اور شوکت کے حصول کے لیے ایمان کو شرط قرار دیا گیا، مثلاً: ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (انفال:۱۹) ﴿وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا﴾ کہ کافر کبھی بھی مومنین پر غلبہ حاصل نہیں کرسکتا۔

مسلمانوں کے ایمان کو کمزور کرنے کی دشمنوں کی سازشیں:

دشمنانِ اسلام نے اس کا ادراک کیا کہ مسلمانوں کی ترقی وکامیابی، سرخروئی وسربلندی کا سرچشمہ ان کا ایمان ہے اور اسی لیے انہوں نے اس انداز میں ان کے خلاف سازشیں رچی۔ چند اعدائے اسلام کے مقولے اس سلسلہ میں پیشِ خدمت ہیں۔

فرانس کا مشہور بادشاہ جس نے صلیبی جنگوں میں مسلمانوں کے ہاتھوں شکست کھائی تھی، اس نے کیا کہا جاننے سے تعلق رکھتا ہے!!

وہ کہتا ہے: ”صرف طاقت، قوت اور بھاری بھرکم ہتھیاروں کے ذریعے مسلمانوں پر غلبہ حاصل کرنا یہ ناممکنات میں سے ہے۔ اگر مغربی اقوام چاہتی ہے کہ وہ مسلمانوں پر غالب آجائے، تو اس کے لیے ضروری ہے کہ ہتھیار سے زیادہ اس چیز کی طرف توجہ دے کہ مسلمانوں میں موجود داخلی اور روحانی طاقت جو بہ صورتِ ایمان ان کے قلوب میں جاگزیں ہے، اسے کس طرح کمزور کیا جاسکتا ہے، اگر وہ اس میں کامیاب ہوگئیں وہ خود بہ خود ان پر غلبہ حاصل کرلیں گے؛ کیوں کہ جب تک مسلمانوں کا عقیدہ مضبوط ہوگا دنیا کی کوئی طاقت ان پر غالب نہیں آسکے گی یہ میرا چیلنج ہے۔ (الیہود والعالم، المؤمرات، الاہداف الاسرار،ص ۷)

اسی مقولہ کی روشنی میں انہوں نے ایک اصول بنایا ہے۔

''جب کوئی قوم تم پر غالب ہوتی ہوئی نظر آئے تو اس کے عقیدے اور فکر میں فساد اور بگاڑ پیدا کر دو وہ قوم اپنے آپ خود ہی کمزور ہو جائے گی اور پھر تم اس پر غالب آ جاؤ گے'' (ایضاً)

اسی لیے صلیبی جنگوں کے بعد مغرب نے پوری قوت طاقت ماسٹر پلاننگ اور تمام تر سریع الاثر اور دور رس وسائل کے ساتھ عالم اسلام میں سیکولرزم اور مادی افکار کو ترویج دی اور ''راند کارپوریشن'' جیسے سیکڑوں ادارے اسی عمل میں مصروف کر دیے۔ نیز ہتھیار سے زیادہ خرچ اسی پر کیا جاتا ہے کہ مغربی افکار کو کس طرح بچوں اور بوڑھوں، جوانوں اور عورتوں میں عام کیا جائے۔

''ارنالڈ ٹوینی'' ایک مشہور مغربی مصنف ہے، جس نے دنیا کی مختلف تہذیبوں کو اپنا موضوع بحث بنایا اور تقریباً ۲۰ کتابیں دنیا کی مختلف تہذیبوں کے سلسلے میں تحریر کی۔ اس نے امتوں اور تہذیبوں کے زوال کے اسباب کے ضمن میں لکھا ہے کہ:

''جب کوئی قوم اپنی اولاد کی دینی تربیت سے محروم ہو جاتی ہے، دنیا کی فانی لذتوں کی دلدادہ ہو جاتی ہے، لذت کوشی اس کا مقصد حیات بن جاتا ہے اور رقص و سرور، ناچ، گانے اور مال اور وقت کو فضولیات میں صرف کرنے لگتی ہے تو وہ خود بہ خود زوال کا شکار ہو جاتی ہے۔ میں نے یہ چیز مشترک طور پر تمام تہذیبوں کے زوال میں محسوس کی یہاں تک کہ حتمی طور پر پائی۔ (ایضاً، ص ۹) معلوم ہوا کہ روحانی اور باطنی سبب کسی بھی تہذیب کے زوال میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ ہمارا ابھی یہی حال ہے۔

فکر و عقیدے کی کمزوری کے اثرات:

جب کسی قوم کا اپنا عقیدہ کمزور ہو جاتا ہے، تو وہ آسانی سے اپنے دشمن کی سازشوں کا شکار ہو جاتی ہے اور دشمن انہیں آپس میں لڑواتا ہے، جس سے ان کی ظاہری طاقت بھی کمزور پڑ جاتی ہے اور علمی صلاحیت میں فقدان کا رجحان بڑھ جاتا ہے، جو اس کے سیاسی زوال پر منتج ہوتا ہے۔ آج امت مسلمہ کے زوال کو اگر دیکھا جائے تو آپ ضرور اس کو محسوس کریں گے کہ دشمن نے پہلے ہمارے عقیدے پر وار کیا جب اس میں کامیابی ملی، تو ہمیں قومیت کے نام پر لڑایا، جس سے ہماری طاقت منتشر ہو گئی اور ہم نے تعلیمی و علمی میدان کو بھی چھوڑ دیا اور آخر کار ہم ہر چیز میں دشمن کے محتاج ہو گئے، اب دشمن ہم پر حکمرانی کر رہا ہے اور اپنی مرضی چلا رہا ہے۔

صلاح الدین ایوبی سے پہلے فلسطین ہمارے ہاتھ سے کیوں گیا؟ یہ ایک چبھتا ہوا سوال ہے کہ آخر کار وہ کیا اسباب تھے!!!

فلسطین کے پانچویں صدی ہجری میں مسلمانوں کے ہاتھ سے جانے کے اسباب:

جیسا کہ اس سے پہلے بیان کیا گیا کہ سیاسی زوال سے پہلے فکری و اعتقادی کمزوری آپسی اختلاف کا باعث ہوتی ہے اور آپسی اختلاف تعلیمی اور علمی کمزوری کا سبب بن جاتا ہے اور تعلیمی اور علمی پسماندگی کا فائدہ دشمن اٹھاتا ہے اور پھر امت سیاسی زوال سے دوچار ہو جاتی ہے۔

فرقہ پرستی سے عالمِ اسلام کی کمزوری کے اثرات:

اگر آپ پانچویں صدی ہجری اور گیارہویں صدی عیسوی میں ۲۲/ شعبان ۴۹۲ھ -۱۵ تموز (۱) (جولائی) ۱۰۹۹ءمیں بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کے مسلمانوں کے ہاتھوں سے چلے جانے کے اسباب کا مطالعہ کریں گے، تو مذکورہ اسباب کو ہو بہو پائیں گے۔ پہلے مسلمانوں میں شیعہ، سنی اختلاف نے شدت اختیار کی، مصر میں فاطمی شیعہ خلافت قائم ہوئی اور عراق میں عباسی خلافت قائم تھی۔ پھر مسلمانوں میں قومی اختلاف پیدا ہوئے، ایک طرف عرب دوسری طرف سلاجقہ اور تیسری طرف اتراک؛ یہاں تک کہ صرف سرزمین شام پر دس چھوٹی چھوٹی ریاستیں اور بادشاہتیں وجود میں آگئیں جو یہ تھیں:

مملکتِ حلب: جس پر ملک رضوان بن تتش کی حکمرانی تھی۔

مملکتِ دمشق: دقاق بن تتش اس کے بادشاہ تھے۔

ریاستِ انطاکیہ: امیر یاغی بن مستان اس کے بادشاہ تھے۔

ریاستِ بیت المقدس: الامیر ان بن سکمان

ریاستِ شیزر: سلطان بن منقذ۔

ریاستِ طرابلس: فخر الملوک ابن عمار۔

ریاستِ حمص: جناح الدولہ ابن ملاعب۔

سلطنتِ فارس: جو بغداد اور اصفہان پر تھی برکیاروق وہاں کا بادشاہ تھا۔

سلطنت سلاجقہ روم۔

مملکتِ خراسان: ابوالحرث سنجر بادشاہ تھے۔

ان دس چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے علاوہ دو بڑی بڑی خلافتیں عالم اسلام میں قائم تھیں۔

خلافتِ عباسیہ عراق اور اس کے گرد ونواح میں۔ خلافتِ فاطمہ قاہرہ اور اس کے اطراف میں۔

---

(۱) سریانی زبان میں جولائی کو تموز کہتے ہیں۔ بعض علاقوں میں مہینوں کے نام آج بھی سریانی مستعمل ہیں مثلاً اردن وغیرہ میں عیسوی مہینوں کو سریانی میں کہتے ہیں:

جنوری-کانون ثانی	مئی-ایار	ستمبر-ایلول
فروری-شباط	جون-حزیران	اکتوبر-تشرین اول
مارچ-آذار	جولائی-تموز	نومبر-تشرین ثانی
اپریل-نیسان	اگست-آب	دسمبر-کانون اول

اوران میں سے ہر ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار تھا۔موقع کو غنیمت جان کر یوروپی اقوام نے اپنا اتحاد قائم کیا اور عالمِ اسلام کی طرف ۴۹۰ھ-۱۰۹۷ء میں قدم بڑھانا شروع کیا اور مشکل سے صرف دو سال کے عرصہ میں وہ فلسطین اور مسجدِ اقصیٰ پر قابض ہوگئے اور ظلم کے وہ پہاڑ توڑے، جس کو بیان کرنے سے بھی بدن تو کیا؛ روح بھی کانپ اٹھتی ہے۔آج دنیا میں حقوقِ انسانی کا ڈھنڈورا پیٹنے والے ان ظالموں کے آبا و اجداد کا کردار بھی ہمیشہ سفاکانہ، قاتلانہ اور جابرانہ رہا ہے۔

اقوامِ یورپ کے بے پناہ مظالم:

مؤرخین نے لکھا ہے کہ ان ظالم مغربی اقوام نے فلسطین میں موجود تمام لوگوں کو قتل کر دیا؛ یہاں تک کہ فتح کے نشے میں دُھت ظالموں نے ان لوگوں کو بھی نہیں بخشا، جو مسجدِ اقصیٰ میں پناہ لیے ہوئے تھے، جن کی تعداد کم از کم دس ہزار بتلائی جاتی ہے۔نہ کسی بچے کو بخشا، نہ کسی عورت کو اور نہ کسی معذور کو۔ایک انگریز مؤرخ "فوشیہ دی شارتر" لکھتا ہے جو خود حملہ میں شریک تھا، کہ جہاں بھی قدم گرتا خون سے لت پت ہو جاتا؛ بل کہ نصف ساق تک خون ہوتا تھا۔امام ابن اثیرؒ نے لکھا ہے کہ مقتولین کی تعداد ۷۰/ہزار سے متجاوز تھی، جس میں دس ہزار علما و فقہا تھے۔

(القدس الشریف ص:۱۸)

صلیبی کمزور ہونے کے باوجود بیت المقدس پر قابض کیسے ہوئے؟:

القدس الشریف کے مصنف الدکتور یوسف حسن غوانمہ نے مسلمان مؤرخین کے حوالہ سے ایک عجیب امر کا انکشاف کیا ہے۔خاص طور پر مشہور اور معتبر مؤرخ تغری بردی کے حوالہ سے کہ:

"تعجب خیز بات تو یہ ہے کہ مغربی اقوام جب قدس پر قبضہ کرنے کے لیے نکلی تو ہر اعتبار سے بالکل کمزور تھی۔یہاں تک کہ ان کے پاس خوراک تک ڈھنگ کی نہیں تھی، ان کے فوجیوں کا بھوک سے برا حال ہوتا تھا؛ بل کہ بعض مرتبہ انہیں مردار کھانے کی نوبت تک آئی اور زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ مسلمان عسکری اور فوجی اعتبار سے بہت مضبوط تھے، مگر اپنی طاقت کا استعمال بجائے دشمن کے خلاف استعمال کرنے کے خود اپنی ریاست کو بچانے اور بڑھانے میں کرتے تھے اور اس کے لیے اپنے کٹر دشمن اور حریف تک کی مدد کر رہے تھے؛ تاکہ اپنے مدِ مقابل مسلمان کو کمزور کیا جائے۔" (النجوم الزاہرۃ جلد ۵ ص ۱۴۸ بحوالہ القدس الشریف ۱۹)

مملکتِ فاطمیہ کا گھناؤنا کردار:

مؤرخین نے تو یہاں تک دعویٰ کیا کہ خلافتِ فاطمیہ اتنی مضبوط تھی کہ وہ پہلے ہی حملہ میں صلیبیوں کو شکستِ فاش دے سکتی تھی، مگر ایسا نہیں ہوا،صرف اتنے ہی پر بس نہیں فاطمیوں نے سلجوقیوں کی شکست پر نصاریٰ کو مبارک باد دی۔لاحول ولا قوۃ إلا باللہ. یہی صورت حال تھی دیگر بادشاہوں کی کہ وہ بڑی بڑی رقم دے کر ان سے معاہدہ کر لیتے تھے۔

پانچویں صدی اور پندرہویں صدی ہجری کے مسلمانوں کے سیاسی منظرنامے کی یکسانیت:

آج کے حالات کا بیت المقدس کے سقوطِ اول کے ساتھ اگر ہم مقارنہ کریں تو معلوم ہوگا، گویا کاپی پیسٹ(Copy pest) ہو رہا ہے۔ بالکل تاریخ اپنے آپ کو دُہرا رہی ہے۔

قدس کی بازیابی کیسے ممکن ہوگی؟

''موشی دیان'' نے اپنی آخری تصنیف ''کیا تلوار فیصلہ کن ثابت ہوگی؟'' میں لکھا ہے کہ مجھے حیفا کے ایک نوجوان مسلمان نے کہا کہ کوئی بات نہیں ایک دن ایسا آئے گا کہ ہم تم یہودیوں کو یہاں سے مار بھگائیں گے؛ یہاں تک کہ اگر کوئی یہودی کسی درخت یا پتھر کے پاس پناہ لے گا تو وہ پکارے گا اے مسلمان! اس جانب آجا یہ یہودی میرے پیچھے چھپا ہوا ہے۔ اس کو موت کے گھاٹ اتار دے تو میں نے (موشی دیان) نے کہا کہ ہاں ایسا ہوگا، مگر اس وقت جب کہ تم بھی عقیدے میں ہماری طرح پختہ ہوجاؤ یعنی دین پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہوجاؤ۔ معلوم ہوا کہ معرکہ قدس کوئی سیاسی معرکہ نہیں بل کہ مذہبی اور دینی قضیہ ہے۔

(الیہود والعالم الموٴمرات، الاہداف الاسرار ص:۸)

معلوم ہوا اگر ہم قدس کی فتح کے لیے سنجیدہ ہیں تو سب سے پہلے عقیدے اور فکر کو فولاد سے زیادہ مضبوط کرنا ہوگا اپنے آپسی اختلاف کو ختم کرنا ہوگا، مزید اسباب کو آئندہ تفصیل کے ساتھ ذکر کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ!

اب یہ بھی جانتے چلیں کہ اس ناکامی کے ۹۰ رسال بعد صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں قدس کیسے فتح ہوا اور اس کے اسباب کیا تھے تاکہ ہمارے لیے بھی ان کا اختیار کرنا آسان ہو جائے۔

صلاح الدین ایوبی کے قدس فتح کرنے سے پہلے کا مرحلہ:

جیسا کہ احقر بار بار اس بات کو دہراتا رہتا ہے کہ مسلمانوں کی کامیابی اور کامرانی دین کی طرف رجوع ہونے میں منحصر ہے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی جنہوں نے تقریباً ۹۰ رسال کے بعد بیت المقدس کو بازیاب کیا، تو یہ اچانک نہیں ہوا تھا؛ بل کہ اس سے پہلے مسلمانوں میں جو کمزوریاں تھا، جن اسباب کی وجہ سے بیت المقدس مسلمانوں کے ہاتھوں سے چلا گیا تھا، ان اسباب کو ختم کر کے کامیابی والے اسباب اختیار کیے گئے، جس پر دکتور ماجد عرسان کیلانی نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب " **هكذا ظهر جيل صلاح الدين وهكذا عادت القدس** '' میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، جس کا ترجمہ پروفیسر صاحبزادہ محمد عبدالرسول نے ''عہد ایوبی کی نسل اور القدس کی بازیابی'' کے عنوان سے کیا ہے؛ یہاں پر اسی سے قدرے ترمیم وحذف واضافے کے ساتھ چند اقتباسات شامل کیے جارہے ہیں، احقر کو ترجمہ پر اطمینان نہیں ہے، اتنی عمدہ جاندار اور شاندار کتاب کا ترجمہ نہیں؛ بل کہ اردو میں اس کی ترجمانی ہونی چاہیے۔ بندہ ان شاء اللہ اس کی کوشش کرے گا۔

قدس کی بازیابی کیسے ممکن ہوگی؟

بیت المقدس پر عیسائی قبضہ کے بعد مسلمانوں میں احساس جاگا اور اس کی بازیابی کی کوششیں تیز ہوگئیں جو دو مرحلے سے گزری:

پہلے مرحلے میں سیاسی بیداری پیدا ہوئی، جس میں سلجوقیوں کا اہم رول رہا؛ البتہ اس مرحلے میں مسجد اقصیٰ کی بازیابی نہ ہوسکی، مگر اس کو تمہیدی مرحلہ ضرور قرار دیا جاسکتا ہے اور دوسرے مرحلے میں اعتقادات کی اصلاح کی طرف خاص توجہ دی گئی، جو مسلمانوں کی کامیابی کے لیے اساس کی حیثیت رکھتا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے: ﴿إن اللّٰہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بأنفسھم﴾ گویا داخلی کمزوری میں تبدیلی ہی اللہ کی طرف سے انقلابِ خیر کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے اور اس کے بعد امت کو مضبوط قیادت بھی میسر ہوتی ہے، جو عصبیت، شخصی جاہ، بالا دستی کی رغبت اور عوامی قوت کو ذاتی تصرف میں لانے سے گریز کرتی ہے، کیوں کہ امتِ واحدہ کے قیام اور ترقی کے لیے ایسے سیاسی افراد اور جماعتوں سے اسلامی معاشرے کا پاک ہونا ضروری ہوتا ہے، جو خاندانی، علاقائی اور فرقہ بندی کے جال میں پھنسی ہوئی ہوں اور ایثار وقربانی کا ان میں فقدان ہو، جس کے ذہن ودماغ پر دنیوی مفاد ومتاع کی حرص مستولی ہو اور عوام کی دینی اصلاح سے اسے کوئی سروکار نہ ہو۔

عالمِ اسلامی میں فکری واعتقادی اصلاح کا آغاز:

عالمِ اسلامی میں اس اعتقادی اصلاح کی تحریک کا آغاز بھی سلاجقہ ہی کے دور میں شروع ہوا، بغداد پر ان کے قبضہ کے بعد سلاجقہ نے ہر دو میدان میں یعنی فکری وعسکری اصلاحات کی کوششیں تیز کردیں۔ ایک طرف نظام الملک نے مدارسِ اسلامیہ کا جال سلاجقہ کے مقبوضہ پورے خطے میں پھیلا دیا اور نظام الملک الطوسی کا ہاتھ بٹانے میں علما کی بڑی تعداد رہی ہے۔ مثلاً: امام الحرمین الجوینی، ابواسحٰق شیرازی، امام قشیری، امام غزالی رحمہم اللہ وغیرہم۔

مگر بدقسمتی سے نظام الملک کی شہادت کے بعد عالمِ اسلامی ایک بار پھر بحران کا شکار ہوگیا، اس بے اعتنائی کے دور میں دو طرح کے علما وجود میں آئے۔ ملک کے سیاسی اکھڑے پچھڑے ایک طبقہ نے کنارہ کشی اختیار کرلی اور گوشہ نشین ہوگئے۔ دوسرا طبقہ وہ تھا جس نے پہلے خود اپنی اصلاح کی اور اس کے بعد حکومت سے علاحدہ ہوکر اپنی اصلاح دو میدانوں میں کی۔ (۱) حُکّام کی اصلاح حکمت کے ساتھ اور دینی فکر کو ان میں زندہ کیا۔ (۲) عامۃ المسلمین میں جو فکری بگاڑ تھا، اس کی اصلاح کی کوشش دو طریقے سے کی، وعظ ونصیحت اور تصنیف وتالیف کے ذریعہ۔ ان کے سرخیل امام غزالیؒ، ابراہیم الشباک جرجانیؒ، ابوالقاسم اسماعیل بن عبدالملک الحاکمیؒ یہ دونوں بھی امام جوینیؒ کے شاگرد اور امام غزالیؒ کے رفیقِ کار تھے۔

القدس کی بازیابی اور امام غزالی کا اہم رول:

القدس کی بازیابی اور امام غزالی کا اہم رول:

امامِ غزالی نے شکست پر آہ و بکا کے بجائے اس کا علاج تلاش کیا اور وہ تھا امت کی فکری واعتقادی اصلاح؛ جو اساسی اور بنیادی سبب ہے۔

اسی لیے کہا جاتا ہے کہ امام غزالیؒ نے جو تحریری کارنامہ انجام دیا، اس کے چند امتیازی پہلو تھے:

امام غزالی کی تحریک کے امتیازی پہلو:

(۱) آپ نے اپنی کتابوں میں دشمن کے خلاف مسلمانوں کو جہاد کرنے پر زور نہیں دیا؛ جیسا کہ بظاہر حالات ایسے تھے کہ جہاد پر ابھارا جاتا؛ مگر آپ دوربیں اور دور اندیش تھے، آپ نے محسوس کیا کہ جہاد سے پہلے ایمان کی پختگی زیادہ ضروری ہے؛ لہٰذا آپ نے ایمان میں قوت پیدا کرنے کے لیے جدوجہد اور محنت کی، یہی وجہ ہے کہ دشمن کے بارے میں لعن وطعن اور ملامت آپ کی کتابوں میں نہیں ملے گی۔

(۲) آپ نے امت کو اپنا ذاتی احتساب کرنے کی دعوت دی اور خود کو بریٔ الذمہ نہ قرار دیتے ہوئے اپنی پسپائی کا ذمہ دار حملہ آور کو نہ قرار دیتے ہوئے اپنی اندرونی کمزوری کو قرار دیا؛ کیوں کہ اصل سبب تو عقیدے میں فتور تھا اور عقیدے میں کمزوری کے ہوتے ہوئے جہاد بھی نفع بخش نہیں ہوسکتا تھا، آج جو لوگ اپنے اندرون کی اصلاح کی فکر نہ کرتے ہوئے محض جہاد کا نام لیتے ہیں، انہیں امام غزالی کے طرزِ عمل سے کچھ سیکھنا چاہیے۔(۱)

(۳) امام غزالیؒ نے اپنی جدوجہد کا آغاز اسلام کے اصل اور بنیادی کام سے کیا اور وہ ہے فکری وذہنی اصلاح؛ لہٰذا آپ نے سیاست اور عسکریت کا راستہ اولاً اختیار نہیں کیا؛ کیوں کہ سلاجقہ کے تجربہ میں امام صاحب یہ بھانپ چکے تھے کہ ڈائریکٹ سیاسی اصلاح کارگر ثابت نہیں ہوتی؛ جیسا نظام الملک کے بعد ہی وہ طاقت بکھر گئی۔(۲)

امام غزالیؒ نے سب سے پہلے خود اپنے نفس کی اصلاح کی اور پھر دوسروں میں تبدیلی لانے کا بیڑا اٹھایا اور آپ کے بعد آپ کے رفقا بھی اسی ڈگر پر چلتے رہے؛ یہاں تک کہ نور الدین زنگی، اسد الدین شیر کوہ، صلاح الدین ایوبی جیسی نسل کا ظہور ہوا، جس کی تفصیل آئندہ آئے گی ان شاء اللہ!

(۴) معاملات کی اصلاح اور علاج بھی آپ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے شروع کی اور آپ نے قومیت سے بالکل تعرض نہیں کیا؛ کیوں کہ سانحۂ قدس سے پہلے مسلمان جس پستی اور تنزلی کا شکار ہو چکے تھے، اس کا ایک اہم سبب عربیت ترکیت وغیرہ قومیتوں میں مسلمانوں کا تقسیم ہونا بھی تھا اور آج بھی مسلمانوں کی یہی صورتِ حال ہے، عربیت وعجمیت میں بٹے ہوئے ہیں؛ پھر عربیت میں بھی مختلف قومیتوں میں مثلاً: عمانی، اماراتی، قطری، بحرینی، کویتی، سعودی، یمنی، مصری، اردنی، لبنانی، فلسطینی، سوری، عجمی، ترکی، ہندی، ایرانی، پاکستانی، بنگالی، چینی، البانی، تاجکی، اوزبکی، ترکمانی، افغانی، اندونیشی، مالمیزی وغیرہ۔ اللہ صحیح سمجھ عطا فرمائے!

---

(۱) اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ جہاد کے منکر یا مخالف تھے یا پیچھے ہٹا کرتے تھے بل کہ اسوۂ نبویؐ کے مطابق آپ نے بھی نبوی طریقہ ہی اختیار کیا جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں تیرہ سال تک ایمان کی مضبوطی کی محنت کی اور جب ایمان میں پختگی آگئی اور ظاہری وباطنی ہر اعتبار سے جہاد کے قابل ہوئے تب مدینہ میں آکر جہاد کا آغاز کیا۔ (۲) ھکذا ظہر جیل صلاح الدین میں تفصیل دیکھیں۔

موجودہ حالات اور مطالعۂ سیرتِ امام غزالی کی افادیت:

آج کے حالات میں ضرورت ہے کہ ہمارے عمائدین امام غزالیؒ کی سیرت کا تفصیل سے مطالعہ کریں اور ان سے کچھ سیکھنے کی کوشش کریں؛ کیوں کہ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے اسلامی معاشرے کے داخلی امراض کے علاج پر اپنی توجہ مرکوز کی اور اس زمانے کی حالات کے اعتبار سے ایسا اسلوب اختیار کیا، جو اُن لوگوں پر اثر انداز ہوسکے اور آپ اس میں کامیاب رہے الحمدللہ۔ فجزاہ اللہ خیرا عن الأمة الإسلامية۔

بعض نادان معاصرین امام غزالیؒ کی انقلابی خدمات کو یہ کہہ کر مسترد کردیتے ہیں کہ وہ صوفی تھے، مگر یہ ان کی تاریخ سے جہالت کا نتیجہ ہے، آپ نے تو امت میں تصوف، عقیدہ، نقد و فلسفہ کی راہ سے جو بگاڑ آیا تھا اسے دور کیا، اور اسلام کے صحیح اعتقادات وافکار اور موقف کو بڑے مضبوط اور ٹھوس انداز میں ثابت کیا۔ تعجب ہے اس تنقید کرنے والے گروہ پر، جو عصرِ حاضر میں فلسفۂ مغرب سے آنے والے بگاڑ کو دور کرنے کے بجائے مسلمانوں ہی میں اہلِ حدیث، اشاعرہ اور ماتریدیہ کی تفریق میں لگا ہوا ہے اور امت کو متحد کرنے کے بجائے منتشر کرنے کے درپے ہے۔ اللہ صحیح سمجھ عطا فرمائے!

امام غزالی کا اصل کارنامہ تعلیمی وفکری میدان کی اصلاح:

امام غزالیؒ کا اصل کام یہ رہا ہے کہ آپ نے اپنے دور کے فکری اور تعلیمی رجحانات پر اولاً مکمل تحقیق کی اور پھر علم کلام سے اپنے کام کا آغاز کیا اور اس کے بعد فلسفہ کا رخ کیا اور اس کی جڑوں کو ہلا کر رکھ دیا؛ بل کہ اکھاڑ پھینکا اور کمال یہ کہ انہیں کے اصول کی روشنی میں آپ اسماعیلیہ اور باطنیہ کے مطالعہ کی طرف آئے اور پھر تصوف کی طرف مائل ہوئے اور ان تمام مراحل میں آپ نے نقد وتمحیص سے کام لیا اور تمام برائیوں اور خرابیوں کا انتہائی مستحکم انداز میں رد کیا؛ ہمیں بھی اسی منہاج پر کام کرنا چاہیے جو یہ ہے:

(۱) فکری و تعلیمی رجحانات کا ناقدانہ مطالعہ۔

(۲) علمِ کلام جدید کو صحیح اسلامی اصول پر مدون کرنا۔

(۳) فلسفۂ جدیدہ کا انہیں کے اصول کی روشنی میں مضبوط رد۔

(۴) ایسے فرقوں کا رد جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، مگر کفریہ اعتقادات کے حامل ہیں۔ نہ کہ وہ فرقے جو اسلامی ہیں اور ایسے عقائد کے حامل ہیں جو قطعی اور اتفاقی ہیں، مگر جزوی طور پر معدودے چند مسائل میں اہلِ سنت سے اختلاف رکھتے ہیں۔

(۵) تصوف میں جو بگاڑ در آیا ہے اس سے امت کو واقف کرانا۔

(۶) فقہ، اصولِ فقہ، قواعد الفقہ اور مقاصدِ شرعیہ وغیرہ میں جو بے اعتدالیاں ہوئیں ہیں، ان کی نشاندہی کرنا، امید کی جاسکتی ہے کہ اس طرز پر اگر کام کیا جائے گا تو آئندہ ایسی نسل وجود میں آئے گی، جو بیت المقدس کی بازیابی کرے گی۔ ان شاء اللہ!

امام غزالی نے امت کے اہم ترین طبقات کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا:

امام غزالیؒ نے امت کے ان طبقات کی اصلاح کی طرف خاص توجہ دی، جن کی اصلاح پر امت کی سربلندی موقوف تھی اور وہ یہ ہیں:

(۱) طبقہ علما کی اصلاح (علمائے سوء وعلمائے حق کے اوصاف تفصیل سے ذکر کیے)

(۲) عبادت گزاروں کی اصلاح (۳) صوفیہ کی اصلاح (۴) مالداروں اور اغنیا کی اصلاح (۵) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا احیا (۶) سلاطین کی اصلاح (۷) مادیت کا عالمانہ رد اور مقابلہ (۸) اجتماعی عدل کی دعوت (۹) انحرافِ فکری کا سدِ باب۔

تحریک غزالی کے دوررس اثرات:

تاہم سب سے اہم اثر جو امامِ غزالیؒ نے چھوڑا، وہ دو امور کی صورت میں نمایاں ہیں:

امرِ اول: ''الاَصحاب'' یعنی عامۃ الناس کی اصلاح سے پہلے خود اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہونا تھا؛ تا کہ دو چیزوں کا تحقق ہو سکے:

(۱) اپنے اس معاشرے میں، جس میں آپ نے پرورش پائی تھی، جو افکار اور اعتقادات پائے جاتے تھے، جس میں عصبیت اور تفرقہ بازی عام تھی، اس کو قرآن وحدیث کی کسوٹی پر پرکھنا اور منقح کرنا۔

(۲) باطنی امراض کی تشخیص کے لیے تصوف اور زہد اختیار کرنا؛ تا کہ نفسانیت سے اپنے آپ کو بچایا جا سکے، اس کے بعد آپ کا طریقہ مختلف مذاہب اور اسلامی جماعتوں کے لیے مثال بن گیا۔ اور ان لوگوں نے مذہبی اختلافات ونزاعات کو خیر باد کہہ کر اپنے ''نفسِ خاصہ'' کی طرف توجہ کی۔ پھر جب ان کا تزکیۂ نفس ہو گیا تو وہ جدید معاشرہ کی طرف ''پلٹ'' آئے؛ تا کہ اس میں تعاون ومحبت کی نیت سے حصہ لیں، نہ کہ فرقہ بازی اور دنیوی مفاد کے لیے اسے ارزاں فروخت کرنے لگیں۔ اسی طریقہ کی بدولت فقہا اور صوفیہ میں ایسے گروہ پیدا ہو گئے جن کا قوی رجحان اس ایمان کی طرف تھا کہ مذہبی فرقوں کی کتب کے بجائے قرآن وسنت سے استنباط و جدوجہد کے ذریعے صحیح فیصلوں کی کامیابی حاصل کی جائے۔

امرِ ثانی: وہ یہ کہ امام غزالیؒ کی کوششوں سے منحرف فکر کے رجحانات مثلاً باطنیہ، فلاسفہ کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور عوام میں فکر اور عقیدے کی صحیح سوجھ بوجھ پیدا ہو گئی۔ (عہد ایوبی کی نسل نو اور القدس کی بازیابی: ۱۵۷تا۱۵۸)

فکرِ غزالی نے ایک باا ثر نسل کے ظہور میں اہم رول ادا کیا:

تحریکِ اصلاح میں؛ جس کی قیادت مدرسہ غزالی اور اس کی توسیعی شاخوں نے کی، کے اثرات زندگی کے مختلف میدانوں میں ظاہر ہوئے۔ایک جدید نسل نے جنم لیا، جس کی ذاتی تکوین اور عملی رویہ کو اسلامی تعلیمات واخلاق کے سانچے میں ڈھالا گیا تھا اور یہ نسل فرقہ وارانہ تعصبات اور دنیاوی شہوات میں ملوث نہیں تھی۔

جب اس جدید نسل کے عناصر پھیلے اور انہوں نے سیاسی، عسکری، تربیتی، اجتماعی اور اقتصادی اداروں میں جگہ پائی اور اپنی جدوجہد کو ان میں مرکوز کیا تو حیاتِ اسلامی کی اندرونی مشکلات اور بیرونی خطرات کا سامنا کرنے میں ان کی سیاست اور جدوجہد کے اثرات ظاہر ہونے لگے۔ (عہدِ ایوبی کی نسلِ نو اور القدس کی بازیابی: ۲۲۰)

امام غزالی کی تحریک کے نتیجہ میں مملکت زنگیہ کا ظہور:

امام غزالیؒ کے تجدیدی اور اصلاحی کارنامے نے نسلِ نو پر جو اثرات مرتب کیے اس کے نتیجہ میں سیاسی بیداری پیدا ہوئی اور مملکۂ زنگیہ کا ظہور ہوا۔

مملکتِ زنگیہ کی تاریخ:

اس مملکت کا سنگِ بنیاد، وزیرِ مصلح نظام الملک کی زندگی میں رکھا گیا، جب کہ نظام الملک نے سلطان ملک شاہ کو شہر حلب اور اس کے مضافات حماۃ، منبج، لاذقیہ وغیرہ کی ولایت پر ''آق سنقر قسیم الدولہ'' کے تقرر کا مشورہ دیا۔

مملکت زنگیہ کا بانی:

آق سنقر نے 477ھ میں تحریکِ جہاد میں شہرت پائی جب وہ اس لشکر کا سالار تھا، جس کی قیادت فخر الدولہ بن جہیر کر رہا تھا، اس کا رخ موصل کی طرف تھا جسے حاصل کر لیا گیا۔مورخ ابو شامہ فرماتے ہیں کہ آق سنقر کی علوِ مرتبت کی دلیل یہ ہے کہ اسے قسیم الدولہ کا لقب ملا؛ کیوں کہ ایسے القاب تو بچا کر رکھے جاتے ہیں اور مستحق کو عطا کیے جاتے ہیں؛ اسی طرح دوسرے تاریخی ماخذ پر اضافہ کرتے ہیں کہ آق سنقر کی ہیبت تمام زیرِ تسلط علاقوں پر چھائی ہوئی تھی وہ رعایا کے بارے میں حکمتِ عملی اور مسلم علاقوں کے دفاع میں سب سے بہتر تھا۔

اس کے علاقوں میں ارزانی انصاف اور امن عام تھا۔اس نے اپنے علاقہ کے ہر شہر کے لوگوں میں یہ شرط لگا رکھی تھی کہ اگر کسی نے تالہ لگایا یا کسی نے کسی کے اہلِ خانہ کو نقصان پہنچایا تو اس کی ساری جائیداد ضبط کر لی جائے گی؛ جب کوئی قافلہ اس کے کسی شہر میں آتا تو وہ اپنا سامان کھول کر ڈال دیتے اور امن کی نیند سو جاتا۔اہلِ شہر اس وقت تک اس کی حفاظت کرتے جب تک وہ قافلہ روانہ نہ ہو جاتا۔چناں چہ شاہراہیں محفوظ ہو گئیں۔

عماد الدین زنگی کا سنہرا دور:

487ھ میں آق سنقر کو قتل کر دیا گیا اور اس کا بیٹا عماد الدین زنگی جانشین بنا۔ وہ اپنے والد کے نقش قدم پر چلتا رہا، تاہم عادات میں اس کا اپنا مقام نمایاں تھا۔ دار الخلافہ بغداد سے دوری کے باوجود اس کا درجہ ایک اہم ترین حاکم کا تھا اور اس سے مسلسل عمدہ کردار کا ظہور ہو رہا تھا۔ (عہد ایوبی کی نسل نو اور القدس کی بازیابی: ۲۲۱)

قدرتی بات تھی کہ اصلاح و تجدید کے علم بردار ایک نئی امتِ اسلامیہ کی بنا ڈالنے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ امتِ جدیدہ، یہی مملکت تھی جس کا آغاز 521ء بغداد کے فتنہ سے واپسی پر عماد الدین نے کر دیا تھا۔ اور اس کو مضبوط کرنے اور رقبہ کو وسعت دینے میں عماد الدین مشغول ہو چکا تھا۔

گویا یہ مملکت اس کی مستحق تھی کہ اسے مملکتِ جدیدہ کا نام دیا جائے۔ جب سلطان بعض سازشیوں کے ہاتھوں شہید ہوا تو اس کا بیٹا نور الدین جانشین ہوا، اور اس نے مملکتِ جدیدہ کے اسلامی امتیاز کو مزید نمایاں کرنے کی کوشش کی۔

نور الدین کے عہد سے یہ مملکتِ آلِ زنگی، ایک ایسا مرکز بن گئی جس کے گرد تجدیدی رجحان رکھنے والے علما اور اصلاحی مدارس کے طلبہ جمع ہونے لگے، انہوں نے اسے دار الہجرت بنا کر ہر طرف سے لوگوں کو بلایا اور مخلصین کے لیے اپنے دروازے کھول دیے، خواہ ان کا فقہی مذہب اور نسبت کوئی بھی ہو۔ اور جو جس کام کے لیے مناسب تھا اسے اس میں لگا دیا۔

مملکتِ زنگیہ کی کامیابی کے پیچھے اجتماعی کوششیں کارفرما تھیں:

جن مورخین نے حالات کی تاریخ لکھی، وہ ان خطوط کی تفصیل نہیں بتاتے جن پر یہ نوخیز مملکت گامزن تھی، اس لیے کہ قدیم اسلامی مورخین کا طریق کار یہ تھا کہ وہ واقعات کو ایسے اشخاص کی طرف منسوب کرتے تھے، جو سیاسی و عسکری قیادت کرتے تھے، وہ دیگر قوی اثرات و عوامل کو نظر انداز کر دیتے تھے۔ وہ واقعات کو اجتماعی عمل کے اثر کے بجائے ایک فرد کے کارناموں کے حوالے سے بیان کرتے اور واقعات کے تسلسل میں ربط پیدا نہیں کرتے تھے۔

تاہم اس مملکت کے ابتدائی ایام سے ہی واقعات کی تاریخ اور نور الدین کی قیادت کی حکمتِ عملی میں، اجتماعی منصوبہ بندی اور تعاون نیز واقعات کا باہمی ربط سامنے آتا ہے۔ موصل میں عماد الدین زنگی کا وزیر مروان بن علی بن سلامہ بن مروان طنزی (دیار بکر کے شہر طنزہ سے نسبت تھا) جس نے بغداد آ کر امام غزالیؒ اور شاشی سے علم حاصل کیا؛ پھر وہ اپنے علاقے میں آ کر امورِ وزارت کی تدبیر میں اپنی وفات (540ھ) تک مصروف رہا۔

نورالدین زنگی کے عہد کے امتیازی کارنامے:

نورالدین کے عہد میں مملکتِ جدیدہ کی سیاست چھ امور میں ممتاز ہوئی، جو یہ ہیں:

اول:.....قوم کو خالص اسلامی انداز میں تیار کرنا اور دینی وثقافتی زندگی کو باطنیہ کے منحرف فکری رجحان اور یونانی فلسفہ کے اثرات اور فاطمی شعائر سے پاک کرنا۔ (یعنی معاشرے میں افکار پر جو خارجی اثر یونانی فلسفہ سے آیا تھا اور باطنی اثر جو فاطمی قوت سے آیا تھا اسے پاک وصاف کر دیا)

دوم:.....انتظامیہ کو اسلامی رنگ دیا اور اجتماعی عدل کو فروغ دیا۔

سوم:.....فرقہ وارانہ تنازعات کو ختم کیا، مضبوط اسلامی اخوت اور وحدتِ عمل اور متحدہ قیادت کی بنیاد ڈالی۔

چہارم:.....اقتصادی زندگی کی خوش حالی کے لیے عوامی منفعت کے حامل اداروں کو قائم کیا۔

پنجم:.....فوجی طاقت کو اپنے بل بوتے پر مضبوط شکل دی۔

ششم:.....شام کی منتشر چھوٹی چھوٹی مملکتوں کا خاتمہ کیا، مصر اور جزیرۂ عرب کے مابین وحدتِ اسلامی کو عملی جامہ پہنایا۔

(عہدِ ایوبی کی نسلِ نو اور القدس کی بازیابی: ۲۲۲ تا ۲۲۳)

تعلیمی بیداری میں مملکت کا کردار:

مملکتِ جدیدہ کے نزدیک پکا اور سچا صحیح مسلمان ہی وہ اہم ستون تھا؛ جس پر امتِ مسلمہ کی بنا قائم ہوتی ہے۔ اس غرض سے قوم کو اسلامی انداز میں تیار کرنے کے لیے جامع پالیسی اختیار کی گئی اور اس پالیسی میں اداروں کو منضبط کیا گیا؛ جہاں نئی نسلوں کی تعلیم پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ اسی طرح اس میں ہدایت وارشاد کو بھی شامل کیا گیا جس کا مقصد عوام الناس کی رہ نمائی کرنا تھا۔ اس میں عسکری تیاری بھی شامل تھی جس کا ہدف، خطرات اور چیلنجوں کے مقابل کو تیار کرنا تھا۔ اس مذکورہ پالیسی کی تفصیلات یہ ہیں:

(۱) **تعلیم اور اداروں کا کردار:** مملکت نے مدارس کی تعمیر اور دورِ قرآن وحدیث کا کام اپنے ہاتھ میں لیا اور مشاہیر علما بالخصوص جو مدارسِ اصلاح مثلاً غزالیہ، قادریہ، عدویہ، حرانیہ اور سہروردیہ کے فارغ التحصیل تھے کو بلایا۔ مملکتِ جدیدہ کے ہاں تعلیم محض دری سرگرمی کا نام نہیں تھا؛ جس میں عملے اور پیشہ ورانہ تربیت کی فراوانی ہو؛ بل کہ ایسی عقائدی سرگرمی مراد تھی جس کا ہدف، متحدہ ملت کی تشکیل نیز اسلامی مقاصد اور موجودہ ضروریات کو پیشِ نظر رکھنا تھا۔ یہ تعلیم کے ادارے دو قسموں میں منقسم تھے:

مدارس: اول: مدارس اور دورِ قرآن وحدیث، ان کا بڑا کام نوجوانوں میں سے نئی نسل کا اخراج تھا، جس کا عقیدہ صاف اور عقلی ونفسی استعداد اس درجہ بلند ہو جس کا حصول ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے۔

مساجد: دوم: مساجد، جن کی تعداد صرف ایک شہر دمشق میں سو سے زیادہ تھی اور وہ عبادت و نماز کے علاوہ ایسے تعلیمی مراکز بھی تھے، جہاں اسلامی روح پھونکنے پر توجہ دی جاتی تھی۔ یہاں اسماعیلی مذہب اور فلسفہ کی تعلیم کو (جس کے اثرات آبادی کے عقائد، عادات اور سیاسی و اجتماعی نظریات میں بہت گہرے تھے) ذہن سے محو کیا جاتا تھا۔ اسی بنا پر ابن جبیر مملکت جدیدہ کے قیام سے پہلے کے احوال قلمبند کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ان لوگوں کے ہاں کوئی اسلام نہیں تھا اور وہ لوگ خواہشات و بدعات کے غلام تھے، سوائے اس کے جس پر اللہ نے رحم کیا اور بعد میں مملکت جدیدہ نے اسے بالکل الٹ دیا سوائے اسلام کی تابع داری کے اور کچھ نہیں رہا۔ (عہد ایوبی کی نسل نو اور القدس کی بازیابی: ۲۲۳)

عامۃ الناس کی اخلاقی تربیت کا انتظام:

(۲) عوامی ہدایت و رہ نمائی: اس کا مقصد مسلم عوام میں سے عالموں مزارعوں اور تاجروں کی رہ نمائی کرنا تھی۔ اس کا موازنہ موجودہ دور کی "تعلیم بالغاں" سے کیا جاسکتا ہے، لیکن یہ منہاج میں اس سے مختلف تھی۔ یہ محض ناخواندگی کے خلاف جنگ تک محدود نہ تھی؛ بل کہ اس کا ہدف اخلاق، تصورات اور عقائد تھے۔ اس میدانِ تربیت میں صوفی شیوخ نے مہارت حاصل کی تھی، خاص طور پر جب سے اصلاحِ تصوف کا کام حضرت شیخ عبدالقادر اور ان کے ہم عصر ساتھی شیوخ نے ہاتھ میں لیا۔ یہ بات نوٹ کی جاسکتی ہے کہ جہاں اصلاحِ تصوف کی تحریک اس کی تطہیر اور گوشہ نشینی سے اسے باہر لا کر مشکلات و خطرات کا سامنا کرنے میں شریک ہوئی؛ وہیں اس کے ساتھ نورالدین کی عنایات، رباط و زاویوں کی تعمیر اور شیوخ کا احترام بھی شاملِ حال رہا۔ ان اداروں نے تعلیمی مدارس کے علاوہ بھی اپنا کردار ادا کیا اور مسلم عوام کی تہذیب میں اپنا وہ فریضہ ادا کیا، جس سے مملکتِ نوریہ کی پالیسی متفق تھی۔

بے مثال عسکری تربیت کا انتظام:

(۳) عسکری تیاری: تعلیم و ارشاد کے علاوہ مملکت تمام امت کی عسکری تربیت میں سرگرم ہوگئی اور اس کی صفوں میں عسکری روح پھونک دی۔ جب نورالدین نے دمشق کو اپنی مملکت میں شامل کر کے اسے اپنا صدر مقام بنایا تو عسکری تربیت کی طرف توجہ بڑھ گئی۔

اس نے جہاد کے موضوع پر کتاب تالیف کی اور اپنے احاطوں میں تربیتی میدان قائم کیے۔ یہ تربیت دو ستونوں پر قائم تھی: معنوی و روحانی تیاری، پھر عسکری تربیت: انہی میدانوں میں نوجوان صلاح الدین کی تربیت ہوئی، جس کے مقدر میں بعد میں وہ کردار تھا؛ جو اس نے ادا کیا۔ جب بعض متشدد علما نے نورالدین پر اس بنا پر ناراضگی کا اظہار کیا کہ وہ تربیت کے میدانوں میں گھڑ سواری اور مشقت کے کھیلوں میں خود شریک ہوتا ہے، تو اس نے جواب دیا کہ وہ کھیل اور لطف کے لیے ایسا نہیں کرتا بل کہ اس کا مقصد گھوڑے کو حرکت اور رخ بدلنے کی اعلیٰ صلاحیت پر قائم رکھنا اور فوج کو جہاد کے لیے کسی بھی غیر متوقع اچانک پکار پر مستعد رکھنا ہے۔

تعصب سے پاک علمی مجالس اور مذاکرے:

تعصب سے پاک علمی مجالس اور مذاکرے:

یہ تعلیمی مراکز، افراد، اداروں اور پروگراموں کے لحاظ سے پوری طرح منظم ہوگئے۔ ابوشامہ اور سبط ابن جوزی نے اس تکمیل وتعاون کی واضح صورت پیش کی ہے۔ یہاں تعلیم وتربیت کے قائدین کی مجالس عام منعقد ہوتیں جن میں کبار فقہا، صوفی شیوخ اور عسکری قائدین شریک ہوتے اور فرقہ واریت کے حساس پہلوؤں اور مذہبی تعصب میں ملوث ہوئے بغیر، ان مجالس میں علمی روح کے تمام موضوعات پر بحث ہوتی۔ نورالدین خود بھی ان مجالس میں شریک ہوتا اور علماوشیوخ کے سامنے اسی طرح بیٹھتا جیسے عام آدمی بیٹھتے۔ اس باہمی تعاون کی وجہ سے علما، شیوخ اور مریدین مملکتِ جدیدہ کی طرف ہجرت کر کے آئے؛ حتیٰ کہ ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی اور ان میں سے ہر ایک نے میدانِ تربیت میں اپنا مقام بنایا۔ نعیمی نے ہزاروں مدارس، دورِ قرآن وحدیث، رباط اور زاویوں کے نام لکھے ہیں، جن میں مذکورہ مساعی کامیابی کے ساتھ جاری تھیں۔

مذکورہ کوششوں کے نتیجہ میں اسلامی روح سے سرشار نسل کا ظہور:

یہ تعلیمی وتربیتی سرگرمی مملکتِ زنگیہ کی نگرانی میں جاری رہی؛ یہاں تک کہ شام کے علاقہ اور اس کی نئی نسل کے لیے پرانا ڈھانچہ بدل گیا اور اس کی جگہ، اسلامی تشخص وچھاپ نے لے لی، جس کی وجہ سے معاشرہ اور اس کے افراد میں اسلامی روح جلوہ گر ہوئی۔ اور اس کی سرگرمیاں، زندگی کے ہر میدان میں رہ نمائی کر رہی تھیں۔

(عہدِ ایوبی کی نسلِ نو اور القدس کی بازیابی: ۲۲۵تا۲۲۶)

''قوم کے باطن میں'' افکار اور رجحانات کی تبدیلی کے لیے، ان تعلیمی وتربیتی مساعی کے سبب ایک ایسی مسلمان نسل پیدا ہوئی، جو سابقہ نسلوں سے مختلف تھی، جن کو ابن جبیر نے خواہشات وبدعات سے متصف کیا تھا اور ابوشامہ نے ان کے بارے میں یہ کہا کہ ان میں سے کسی میں ہمت نہ تھی کہ شرم گاہ یا پیٹ کی خواہش کو روک سکے۔

مسلمانوں کی نئی نسل میں صلاح الدین کا ظہور:

اس نئی نسل کے افراد میں سے ایک کم سن نوجوان صلاح الدین بن یوسف بھی تھا، جو بعد میں نورالدین کا جانشین بنا۔ شاید صلاح الدین کی ابتدائی زندگی کے بارے میں سب سے ثقہ ماخذ سیرتِ ابن شداد ہے جو صلاح الدین کے لشکر کے قاضی تھے اور جنہیں وہ اپنی زندگی کے آخری حصہ میں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ ان کی تحریر کردہ سیرت جس کا نام ''المحاسن الیوسفیة والنوادر السلطانیة'' ہے صلاح الدین پر لکھی گئی تمام کتابوں میں سے سب سے زیادہ ثقہ قرار دی جاتی ہے۔

صلاح الدین کی زندگی کے ابتدائی حالات:

صلاح الدین کی ابتدائی زندگی کے حالات کے بارے میں وہ تحریر کرتے ہیں کہ وہ سن 532ھ میں قلعہ ''تکریت'' میں پیدا ہوا۔ پھر اپنے والد جو نورالدین کے فوجی محافظین میں سے تھے۔ کی زیرِ نگرانی موصل اور بعلبک آیا۔ اس وقت صلاح الدین ایک عام نوجوان تھا، جس نے اپنے اوقات مشقت کے کھیلوں، گھڑسواری اور دیگر کھیل تماشوں کے لیے وقف کر رکھے تھے۔ اس کی یہی مصروفیت تھی؛ یہاں تک کہ وہ اپنے چچا اسدالدین شیرکوہ، جو نورالدین کے لشکر کے بڑے امرا میں سے تھے، کے ساتھ مصر پر حملہ کرنے کی غرض سے نکلا؛ جہاں اس نے اس اعتقادی کیمپ میں شمولیت اختیار کی جو فکری، روحانی اور عسکری تربیت میں اہم رول ادا کرتے تھے۔ صلاح الدین اس کیمپ میں شمولیت کی موقعہ پر اپنی ذاتی کیفیت یوں بیان کرتے ہیں:

''میں اس وقت باہر جانے کو بہت ناپسند کرتا تھا اور میں اپنے اختیار سے چچا کے ساتھ نہیں نکلا تھا، اللہ تعالیٰ کے قول کا یہی مطلب ہے: عسی ان تکرھوا شیئاً وھو خیر لکم'' شاید کہ کوئی چیز تم ناپسند کرتے ہو اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو۔ (سورہ بقرہ۔216)''

صلاح الدین پر اسلامی ماحول کا اثر:

اسلامی رہنمائی کی تاثیر سے صلاح الدین کی شخصیت میں تبدیلی رونما ہوئی اور نورالدین کی قیادت میں چلنے والی تحریکِ اسلامی میں اس نے اپنا مقام بنالیا، جو اس کے چچا اسدالدین کی وفات کے بعد مستحکم ہوئی اور صلاح الدین نے اس کی جگہ مصر کے امور سنبھالے۔ وہ کہتا ہے:

صلاح الدین تعیش سے زہد وتقویٰ کی طرف:

''اس کے بعد معاملات سلطان کو تفویض ہوگئے۔ اس نے قواعد کو مضبوط بنایا، احوال کو مستحکم کیا، شراب سے توبہ کرلی، ہر قسم کے کھیل تماشوں سے منہ موڑ لیا، بزرگی اور ریاضت کا لباس زیب تن کیا۔ پھر اسے ترک نہ کیا اور نہ اس میں کمی بیشی کی؛ یہاں تک کہ اللہ نے اسے اپنی رحمت کی طرف اٹھا لیا۔''

علامہ سبکی بھی اس کی تبدیلی کی تائید کرتے ہیں اور کہتے ہیں: ''جب صلاح الدین کا تعلق نورالدین کی ملازمت سے ہوا تو اس نے ملذات کو خیرباد کہا''۔

ابن شداد نے ہمیں بعض علما کے نام بتائے ہیں، جنہوں نے صلاح الدین کی زندگی کو متاثر کیا۔ وہ کہتا ہے: ''صلاح الدین نے کبار علما سے علم حاصل کیا، ان میں سے زیادہ مشہور قطب الدین نیشاپوری تھے جنہوں نے اس کے اور اس کی اولاد کے دل میں اسلامی عقیدے کو راسخ کیا۔ سبکی مزید کہتے ہیں کہ صلاح الدین نے حافظ ابوطاہر سلفی، ابوطاہر بن عوف، شیخ قطب الدین نیشاپوری، عبداللہ بن بری نحوی اور دیگر علما سے حدیث سماعت کی۔

بہت سے غیرت مندوں پر یہ بات گراں گزرتی ہے کہ وہ صلاح الدین کے متعلق ایسی باتیں سنیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اسے بچپن سے نیکی و پرہیز گاری کا مجسمہ بتایا جائے؛ کیوں کہ ان کے خیال میں اسلام کے اس بطلِ عظیم کے لیے یہی صورت موزوں ہے یا ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی ابتدائی زندگی کی تفصیلات پر غور نہ کیا جائے؛ کیوں کہ ان کی سمجھ کے مطابق، اس عظیم مجاہد کے سامنے یہی ادب مناسب ہے۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ صلاح الدین کی ابتداور نہجِ اسلام سے دور رہنا؛ جس طرح ہم نے اس کا تجزیہ کیا ہے، اس سے صلاح الدین کو کوئی ضرر نہیں پہنچتا۔ اسلام کے لیے یہ بات قابلِ فخر ہے کہ اس میں ہمیشہ یہ قدرت رہی ہے کہ وہ بندوں کی گراوٹ کے باوجود ان کی تشکیلِ نو کرتا ہے۔ یہ اس کردار کے لیے خاص طور پر مفید ہے، جسے عنایتِ خداوندی نے اپنی نمائندگی کے لیے چن لیا ہو؛ کیوں کہ اسے خیر و شر کی تمام معلومات ہوتی ہیں۔ اس بارے میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فیصلہ فرمایا تھا ''اسلامی رابطوں میں سے وہ رابطہ کمزور ہوتا ہے، جس کا آغاز اسلام میں ہی ہوا ہو اور اس نے جاہلیت کو نہ دیکھا ہو۔

شر کا ذائقہ چکھ کر خیر کی طرف آنے والا زیادہ ثابت قدم ہوتا ہے:

ابن تیمیہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول کی شرح بیان کی ہے۔

''جس نے شر کو پہچانا اور اسکا ذائقہ چکھا، پھر خیر کو پہچانا اور اس کا ذائقہ چکھا تو اس میں خیر کی معرفت اور شر سے نفرت اس شخص سے کہیں زیادہ ہوتی ہے، جس نے خیر و شر کو نہ جانا ہو اور نہ چکھا ہو۔ اسی لیے صحابہ رضی اللہ عنہم بعد میں آنے والوں کے مقابلہ میں ایمان و جہاد کے معاملہ میں بہت عظیم تھے؛ کیوں کہ وہ خیر و شر دونوں کو خوب جانتے تھے۔ خیر کے لیے ان کی محبت اور شر کے لیے ان کی نفرت کمال کو پہنچی ہوئی تھی، اس لیے کہ انہیں علم تھا کہ اسلام، ایمان اور عمل صالح میں کیا خوبی ہے اور کفر و گناہ میں کیا قباحت ہے؟

موجودہ نسل جو برائی کے دلدل میں پھنسی ہے، صلاح الدین کی زندگی سے سبق سیکھے:

اس صورت حال کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے تاکہ وہ دورِ حاضر کی نسلوں کے لیے امید اور ترغیب بن جائے۔ یہ نسلیں جو مایوسی، شکست خوردگی اور ضعف کا شکار بن چکی ہیں؛ کیوں کہ اسلام جس نے صلاح الدین اور اس کی نسل کی تشکیل نو کی، اس پر قادر ہے کہ وہ ضعف اور اخلاقی نافرمانی سے داغدار نسلوں کی تشکیل نو کرے؛ بشرطے کہ حکیمانہ انداز کے تعلیمی ادارے قائم ہو جائیں۔ یہی نوجوان ہیں جو خام مال ہیں جن پر توجہ کر کے ان کی صفوں سے ''جدید صلاح الدین'' اس کے معاون اور ارکانِ حکومت نکالے جاسکتے ہیں۔

یہ تبھی ممکن ہے جب محکم تعلیمی منہاج فراہم کیا جائے اور ایسے ''علمائے آخرت'' تلاش کیے جائیں، جو ''تزکیہ نفس'' کو سمجھتے ہوں اور سلوک کو عملی صورت دے سکتے ہوں، نہ کہ ''علمائے دنیا'' جو منبروں ''ٹیلی ویژن'' مذاکروں اور عام جلسوں میں جوانوں کے عیوب اور ان کی غلطیوں کی تشہیر کرتے ہوئے خطاب کرتے ہوں اور یونیورسٹیوں اور علمی حلقوں کے طلبہ میں گروہی و مذہبی تنازعات ابھار کر ان کو اشتعال دیتے ہوں۔ (عہد ایوبی کی نسل نو اور القدس کی بازیابی: ۲۲۷تا۲۳۰)

شر کا ذائقہ چکھ کر خیر کی طرف آنے والا زیادہ ثابت قدم ہوتا ہے:

صلاح الدین کی کوششوں سے سیاسی وحدت کا وجود میں آنا:

سیاسی وحدت کی جانب پہلا قدم یہ تھا کہ 545ھ/ 1151ء میں طویل مزاحمت کے بعد مملکتِ دمشق کو سلطنت زنگیہ میں شامل کرلیا گیا۔ اس دوران اس کے حاکم نے مملکتِ جدیدہ کی مخالفت میں القدس کی صلیبی حکومت کے ساتھ معاہدہ کرنے کی کوشش بھی کی۔ اس وقت میں دمشق کا ایک استبدادی گروہ بھی اس کے ساتھ تعاون کررہا تھا ، جو دمشق کی دولت سے فائدہ اٹھاتا تھا۔ ڈاکٹر حسین مونس نے ان تمام مراحل کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، جن سے گزر کر مملکتِ دمشق بالآخر نورالدین کے قبضہ میں آئی اور اس طرح ان کے باشندوں نے نورالدین کو خود دعوت دی اور اس کی اطاعت قبول کی۔ "یہ مملکتِ دمشق ۔جنوب میں بیت المقدس کی صلیبی حکومت کی حد تک پھیلتی چلی گئی تھی ۔اب نورالدین اس حکومت کے درمیان وسیع میدان حائل تھا، جو دونوں کو آمنے سامنے لانے میں حدِ فاصل کا کام دیتا تھا۔ دمشق پر قبضے سے قوتِ اسلامی میں اضافہ ہوا۔ بہادر لوگوں میں جہاد کا جذبہ تیز ہوا اور مصر کی طرف راستہ کھل گیا"۔

مملکتِ فاطمیہ کا زوال اور سقوط:

مملکتِ فاطمیہ کا زوال اور سقوط:

اسی طرح ایک دوسری علاحدگی پسند حکومت یعنی مملکتِ فاطمیہ مصر کے ساتھ آمنے سامنے ہوگئی۔ مصر سے قریب ہونے کے طریق کار نے نورالدین اور صلیبیوں کے درمیان تعلقات میں اضطراب کی کیفیت پیدا کی۔ وہ یوں کہ سلطان نے اپنی مملکت اور مصر کے درمیان واقع چند صلیبی ٹکریوں کو صاف کرنے کا عزم کیا؛ اسی طرح اس نے واعظوں کو مصر روانہ کیا؛ تاکہ رائے عامہ کو ایسے مخلص فاتح کے استقبال کے لیے تیار کیا جائے جو اسلامی وحدت کا علم بردار ہو؛ کیوں کہ اس کے بغیر شہروں کی آزادی اور خطرات کے سدِ باب کا اور کوئی ذریعہ نہیں۔

مملکتِ فاطمیہ کے زوال میں واعظوں کا رول:

ہم ان واعظوں میں ابن نجا الواعظ اور محمد بن موفق جبوشانی کا اضافہ کرتے ہیں جو 500ھ میں مصر میں داخل ہوئے۔ انہوں نے صحیح اسلام کی تبلیغ شروع کی، فاطمیوں پر لعن کیا اور انہیں زندیق اور یہودی قرار دیا۔ عالمِ اسلام میں ہر طرف اس کی خبریں پھیلیں اور مصر پر حملہ کے لیے صلاح الدین کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ مورخ سبکی کے نزدیک فاطمیوں کے خلاف مصری رائے عامہ ہموار کرنے میں یہ سب سے اہم سبب تھا۔

نورالدین کا مصر پر قبضہ:

نورالدین مصر میں داخلہ کے لیے مناسب موقعہ کے انتظار میں رہا۔ یہ موقعہ اسے اس وقت ہاتھ آیا جب ایک دوسرے کے خلاف نورالدین اور صلیبیوں سے امداد طلب کی، اس کے نتیجہ میں نورالدین نے 562ھ/ 1167ء اسدالدین شیرکوہ اور اس کے بھتیجے صلاح الدین کے تحت ایک مہم روانہ کی۔ جب یہ مہم مصر میں داخل ہوئی تو وہاں صلیبیوں کی طرف سے بھی ایک فوج پہنچ چکی تھی، ایک مدت تک ان دونوں میں جھڑپیں ہوتی رہیں، اس دوران فاطمیہ مصر کے حکام نے اپنے مفادات کے پیش نظر طرفین سے کھیل جاری رکھا۔ مصر پر نورالدین کی گرفت 564ھ/1169ء میں کہیں جاکر مستحکم ہوئی، جب کہ صلاح الدین نے وزیر شاور کو اسلام سے غداری اور صلیبیوں سے سازباز کرنے کے الزام میں قتل کردیا۔

مصر پر نور الدین کے قبضے نے صلیبیوں کے پیر اکھاڑ دیے:

مصر میں نور الدین کے داخلہ کی صدائے بازگشت نہ صرف بیت المقدس کی صلیبی حکومت؛ بل کہ تمام یورپ میں سنائی دی چناں چہ انہوں نے مشرق پر ایک نئے صلیبی حملے کی تیاری شروع کر دی۔ دوسری طرف حالات نے ایسا رخ اختیار کیا جو فاطمی خلافت کے خاتمہ اور مصر کو مملکتِ اسلامیہ میں شامل کرنے پر منتج ہوا۔

اس کے بعد نور الدین صلیبیوں پر حملہ آور ہوتا رہا اور مقدس مقامات کو بازیاب کرتا رہا یہاں تک کہ وہ پچاس سے زائد شہروں کو صلیبیوں سے واپس لینے میں کامیاب رہا۔

نور الدین کا بیت المقدس کے لیے منبر تیار کروانا:

اب نور الدین نے بیت المقدس کی فتح کا ارادہ کیا اور مسجد اقصیٰ کے لیے ایک نیا منبر تیار کروایا (اس سے نور الدین کے عزمِ مصمم اور فتح کے یقین کا بھی پتہ چلتا ہے اور اللہ پر اعتماد کا بھی علم ہوتا ہے) لیکن 569ھ/ 1174ء میں انہیں اس وقت موت نے آلیا جب وہ تیاریوں میں مصروف تھے۔ اب معاملہ اس کے عظیم ساتھی والیِ مصر صلاح الدین ایوبی کے ہاتھ میں آیا جو اُن مقاصد کے حصول میں اپنے طریقِ کار پر گامزن رہا۔

القدس الشریف پر صلاح الدین کا قبضہ:

مسلمان صلاح الدین کی قیادت میں مختلف مقامات پر حملہ آور ہوتے رہے؛ یہاں تک کہ جب مناسب وقت آیا تو القدس کی جانب چل پڑے اس لشکر میں تمام سالار، امرا، علما، فقہا اور صوفیا شامل تھے۔ ان میں موفق الدین بن قدامہ، ان کا بھائی محمد بن قدامہ اور ابن نجا الواعظ موجود تھے۔ یہ لوگ تمام فقہی مذاہب اور جماعتوں سے تعلق رکھتے تھے، اس جگہ ان سب کے نام تحریر کرنے کی گنجائش نہیں۔

شہر القدس میں مسلمانوں کے داخلے کا دلفریب منظر:

مسلمانوں نے جنت اور شہادت کے شوق و جذبہ سے قابضین سے شدید جنگ کی، پھر وہ تکبیر اور کلمۂ طیبہ پڑھتے ہوئے ۵۸۳ھ مطابق ۱۱۸۷ء شہر میں داخل ہوئے۔ تمام مجاہدین نے مسجدِ اقصیٰ کا رخ کیا اور اسے قابضین کی جمع کردہ گندگی سے پاک کیا۔ پہلے جمعہ کے دن ''مسجد نمازیوں سے بھر گئی اور رقتِ قلب کے ساتھ آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا'' صلاح الدین نے ابن زکی الشافعی کو بلا کر خطبہ دینے کو کہا، انہوں نے ان الفاظ سے خطبہ شروع کیا ''ظالم قوم کی جڑ کاٹ دی گئی تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو اسلام کو اپنی نصرت سے عزت بخشنے والا، شرک کو اپنے قہر سے ذلت دینے والا، اپنے حکم سے معاملات چلانے والا اور اپنے منصوبوں سے کفر کو مبتلائے فریب کرنے والا ہے۔'' پھر انہوں نے حاضرین کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا: ''اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے بیت المقدس کی فتح جیسے عظیم کام کو آسان بنادیا، جس کی شان یہ ہے اور یہ ہے .... انہوں نے بیت المقدس کے فضائل بیان کیے کہ وہ دو قبلوں میں سے پہلا قبلہ، دو مسجدوں میں سے دوسری مسجد اور دو حرموں کے بعد تیسرا حرم ہے...... اسی طرح یہیں یوم محشر برپا ہوگا، یہی انبیا کا ٹھکانہ اور اولیا کی منزل ہے......''

نماز کے بعد صلاح الدین نے ابن نجا قادری حنبلی کو دعوت دی کہ وعظ فرمائیں، وہ ہجوم کے درمیان کھڑے ہوئے اور ابوشامہ کی روایت کے مطابق:

''صلاح الدین نے وعظ کے لیے قبلہ کی جانب بڑا تخت نصب کیا، زین الدین ابن نجا اس پر بیٹھ گئے، انہوں نے خوف ورجا کا ذکر کیا، ایسی نصیحت کی جس نے سوتوں کو جگایا، اللہ کے دشمنوں کو آڑے ہاتھوں لیا، رونے والوں کا شور بلند ہوا، اشک میں مبتلا چیخیں اٹھیں، دلوں میں رقت پیدا ہوئی اور رنج والم کم ہوگئے......''

دوسرے جمعہ کو سلطان نے ابن نجا کو پھر طلب کیا کہ دوبارہ مسجد میں وعظ کریں چناں چہ انہوں نے تعمیلِ حکم کی۔ مؤرخ ابن شداد کا بیان ہے کہ بیت المقدس کی فتح کے بعد سلطان صلاح الدین نے اس سے کہا کہ اس کی آرزو ہے کہ وہ بہترین موت مرے، جب اس سے پوچھا گیا کہ اس سے اس کی کیا مراد ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ میں چاہتا ہوں کہ بحری سفر اختیار کر کے فرنگیوں کے ملک یورپ میں ان سے جنگ کروں اور اسلام کی اشاعت کروں۔

(عہد ایوبی کی نسلِ نو اور القدس کی بازیابی: ۲۶۲ تا ۲۶۵)

فتح بیت المقدس میں اہم کردار ادا کرنے والی شخصیات:

صلاح الدین ایوبیؒ کے ظہور سے قبل عالمِ اسلام تین مرحلوں سے گزرا: سیاسی بیداری، تعلیمی وفکری بیداری، امت میں اجتماعی طور پر ہر قسم کی بیداری۔ مرحلۂ اولیٰ میں اہم رول ادا کرنے والی شخصیات:

۱- نظام الملک الطوسی۔
۲- امام الحرمین الجوینی۔
۳- ابواسحاق الشیرازی۔
۴- ابوالقاسم القشیری۔
۵- ابوعلی الفارندی۔
۶- سلطان الپ ارسلان۔
۷- ملکشاہ۔
۸- آق سنقر۔
۹- عمادالدین زنگی۔
۱۰- ابومسلم مہر بن یزید۔
۱۱- ابوحامد الأزہری۔
۱۲- ابوالحسن محمد بن علی الواسطی۔
۱۳- الامام ابن عقیل۔

مرحلۂ ثانیہ میں اہم رول ادا کرنے والی شخصیات:

۱-الامام الغزالی حجۃ الاسلام۔

۲-نورالدین زنگی۔

۳-اسدالدین شیرکوا۔

۴-ابراہیم الشباک الجرجانی۔

۵-ابوالقاسم اسماعیل بن عبدالملک الحاکمی۔

۶-مروان بن علی بن سلامہ بن مروان طنزی۔

۷-الکیاالہراسی۔

مرحلۂ ثالثہ میں اہم رول ادا کرنے والے شخصیات:

۱-صلاح الدین ایوبی۔

۲-قطب الدین نیشاپوری۔

۳-حافظ ابوطاہر السّلفی۔

۴-ابوطاہر بن عوف۔

۵-عبداللہ بن بری نحوی۔

۶-ابن نجا الواعظ۔

۷-محمد بن موفق حبوشانی۔

۸-موفق الدین ابن قدامہ۔

۹-محمد ابن قدامہ۔

۱۰-ابن الذکی الشافعی۔

گویا علما اور حکام کی مجموعی بیداری نے بیت المقدس کی کامیابی میں اہم رول ادا کیا۔

میں نے بالقصد بیت القدس کی پہلی بازیابی کے تمام پہلوؤں کو تفصیل کے ساتھ جمع کیا؛ تاکہ ہم اس سے سبق حاصل کریں اور اسی انداز میں تیاری کریں۔ امام مالکؒ نے فرمایا "لن یصلح آخر هذه الأمة الا بما صلح به أولها" آیئے! اب ہم موجودہ آخری صدی میں بیت المقدس پر کیا گزری، اور اس دور میں دوبارہ اس کی بازیابی کے لیے کیا لائحۂ عمل تیار کیا جانا چاہیے اس پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح لکھنے کی اور ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

خلاصہ بحثِ مذکور:

بیت المقدس کی تاریخ آغاز سے لے کر فتحِ اسلامی اول تک اور فتح ثانی کے بعد سے بیسویں صدی کے اوائل تک دو مستقل مضامین میں ذکر کیے جائیں گیں۔ ابھی یہاں فلسطین کے مسلمانوں کے ہاتھوں سے جانے سے لے کر قیامِ اسرائیل تک اور قیام اسرائیل سے لے کر اب تک کی تاریخ پر، نیز فلسطین پر مسلمانوں کے قانونی تاریخی اور دینی حق کے اثبات پر روشنی ڈالی جائے گی۔ اور اخیر میں فلسطین کی بازیابی کے لیے کوشش کا آغاز کہاں سے کیا جائے یہ بتلایا جائے گا؛ تاکہ جہاد بالسنان سے پہلے جہاد بالقلم کے فریضہ کو ادا کرنے کی مقدور بھر کوشش کی جائے۔ اللہ اخلاص کے ساتھ ارض مقدس کے لیے ہمیں ہر طرح کے جہاد کی توفیق مرحمت فرمائے۔

مسلمانوں کا اپنے دور میں یہود و نصاریٰ کے ساتھ حسنِ سلوک:

تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں نے نہ صرف عیسائیوں؛ بل کہ یہودیوں کے ساتھ جو رواداری کا رویّہ اختیار کیا، وہ اُن کے ساتھ عیسائیوں نے کبھی اختیار نہ کیا۔ عیسائیوں نے صلیبی جنگ میں بیت المقدس کو فتح کیا، تو سارے یہودیوں کو ایک جگہ جمع کرکے اپنے گرجا گھر کے اندر نذرِ آتش کر دیا۔ ۱۰۹۹ء سے ۱۱۸۷ء کے عرصے میں شہرِ قدس میں یہودیوں کا داخلہ بالکلیہ ممنوع رہا۔ صلاح الدین ایوبی (یوسف بن ایوب بن شاذی ابوالمظفر صلاح الدین ایوبی مقلب بہ "ملک نصر" ۵۳۲ھ/۱۱۳۷-۵۸۹ھ/۱۱۹۳ء) نے بیت المقدس کو فتح کیا، تو اُن کے لیے یہاں آمد کی راہ پیدا ہوئی۔

یہودیوں کی سفاکانہ فطرت:

مسلمانوں کی طرف سے روادارانہ رویّے کے باوجود، جہاں یہودیوں نے، جن کی فطرت میں غدّاری، عیّاری، بغاوت، ظلم شعاری اور خدا اور اُس کے رسولوں کی نافرمانی رچی بسی تھی؛ مسلمانوں سے اپنی ابدی دشمنی کو نہیں بھلایا، وہیں اہلِ صلیب نے، صلیبی جنگوں کو صلاح الدین ایوبیؒ اور آپ کی نجیب الاصل اولاد و اخلاف کے ہاتھوں بُری طرح ہار جانے کے باوجود؛ اپنے ناپاک صلیبی جذبے کو فرو نہیں ہونے دیا؛ بل کہ اُس کو ہمیشہ اور ہر ممکن طریقے سے، اپنے سینوں میں فروزاں رکھا اور اپنے عمل سے، تاریخ کے ہر دور میں، اپنے اُس جذبے کو تسکین دینے کی کوشش کی۔ اِسلام دشمنی کی ہمہ گیر شکلیں آج بھی فرزندانِ تثلیث کی طرف سے، روبہ عمل آرہی ہیں اور اُن کی بے پناہ چالاکی اور "زیرکی" کے باوجود، صلیبی روح کی کارفرمائیاں چھپائے نہیں چھپتیں۔ اقتصادی وعسکری، سیاسی واجتماعی یلغاروں کے ساتھ ساتھ، تہذیبی وثقافتی حملوں اور قبضوں کے سارے نت نئے اور دیرینہ استعماری طریقوں کے ذریعے، عالمِ اسلام وعالمِ عرب پر مسلّط اور مکمل غلبے کا بھرپور کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ عالمی تنظیم "اقوامِ متحدہ" اور طرح طرح کی خیراتی وتبلیغی انجمنوں اور خفیہ اداروں کے ذریعے، استعماری عمل کو استحکام دینے کی ایسی طرح ڈالی گئی ہے کہ اُمتِ مسلمہ کے سارے عُقلا وقائدین بھی اُس کے سحر کا کوئی توڑ، اِیجاد کرنے سے قاصر ہیں۔

عالم اسلام کے حکمرانوں کی بے حسی:

عالم اسلام کے حکمرانوں کی بے حسی:

ہمارے قائدین وحکم راں تو اِس سحرِ سامری کا بالکلیہ شکار ہیں۔ افسوس ہے کہ امت کے چیدہ طبقے، جن کے ہاتھ میں عالمِ اسلام کی زمامِ کار ہے، کے دل سے احساسِ زیاں نہ صرف مفقود ہو چکا ہے؛ بل کہ اسی سحرِ سامری کی وجہ سے ''زیاں'' کو ''سود'' سمجھ بیٹھے ہیں۔ زیاں کا یہ تسلسل، اِسی لیے ختم ہونے کا نام نہیں لیتا کہ اس کو ہمارے قائدین حکمرانوں کی طرف سے، ''سود'' کے عمل کے طور پر شوق سے انجام دیا جارہا ہے۔

نصاریٰ کا قیامِ اسرائیل میں یہودیوں کا ساتھ دینا:

حقیقت یہ ہے کہ اہلِ صلیب نے اسلام دشمنی میں ہی قاتلانِ انبیا وملعونین الٰہی یہود کا ساتھ دینے اور اُن کے لیے فلسطین میں ''قومی وطن'' بسانے کی تحریک چلانے، اُس کو کامیاب بنانے اور بالآخر وہاں اُن کی ناجائز ریاست قائم کردینے کی ٹھانی۔ ''مجر'' (Magyar, Hongrie) کے ایک یہودی رائٹر ''ٹیوڈ رہرزل'' (Tudor Herzel) (۱۸۶۰ء-۱۹۰۴ء) کو اس تحریک کے لیے اکسایا، اُس نے اس موضوع پر نہ صرف یہ کہ قلم اٹھایا؛ بل کہ ۱۸۹۷ء (۱۳۱۵ھ) میں سوئزرلینڈ (Suisse) کے شہر ''بازل'' (Basel) میں یہودیوں کی عالمی کانفرنس منعقد کی اور صہیونی تحریک کی بنیادی قرارداد پاس کرکے، قومی وطن کے قیام کی تحریک زور وشور سے شروع کردی، جس میں فرزندانِ تثلیث کی مکمل پشت پناہی یہودیوں کو حاصل تھی۔

سلطان عبدالحمید الثانی کا غیرت مندانہ رول:

آج سے تقریباً ۱۵۰ سال قبل یہود ونصاری کے گٹھ جوڑ نے کس طرح قیامِ اسرائیل کی راہ ہموار کی اس پر تفصیل سے روشنی ڈالنے سے قبل یہاں اجمالاً اس پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

تاریخی شواہد یہ بتاتے ہیں کہ ارضِ فلسطین میں یہودیوں کے قومی وطن کے قیام کی قرارداد کو روبہ عمل لانے میں پیش قدمی کی اولین بنیاد کی استواری کے لیے ''ایمانویل قرہ صو'' نام کے ایک سرگرم اور عیار یہود کو، غیرت مند سلطانِ عثمانی: خلیفہ عبدالحمید ثانی (۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲-۱۳۳۶ھ/۱۹۱۸ء) کی خدمت میں بھیجا گیا، جس نے انھیں یہودیوں کی طرف سے یہ پیش کش کی کہ اگر عالی جاہ سلطان فلسطین میں یہودیوں کے لیے ایک قومی وطن کے قیام کی اجازت مرحمت فرمادیں، تو صہیونی تحریک خلافتِ عثمانیہ کو پچاس کروڑ پاؤنڈ اور بہ طورِ خاص عالی جاہ کے ذاتی خزانے کے لیے مزید پچاس لاکھ پاؤنڈ دینے کے لیے، بہ سروچشم تیار ہے۔ پیشِ نظر رہے کہ اُس وقت خلافتِ عثمانیہ شدید مالی بحران کا شکار تھی اور دشمنوں کے نرغے میں بھی گھری ہوئی تھی، اگر آج کے ضمیر فروش وبے غیرت اور نام کے مسلمان بادشاہ اور حکمراں ہوتے تو کیا کرتے، یہ بتانے کی ضرورت نہیں؛ لیکن سلطان عبدالحمید ثانیؒ نے انھیں جو جواب دیا، وہ تاریخِ اسلامی میں آبِ زر سے لکھے جانے کے لائق ہے، مسلم مؤرخین نے اُن کے جواب کو اِحساسِ اِفتخار کے ساتھ اِس طرح درج کیا ہے:

''ڈاکٹر ''ہرزل'' سے جا کے یہ کہہ دو کہ اِس سلسلے میں آج کے بعد کوئی سلسلۂ جُنبانی نہ کرے؛ کیوں کہ میں ہرگز دوسروں کو دینے کے لیے، ارضِ مقدس کے ایک بالشت سے بھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔ ارضِ فلسطین میری مِلکیت نہیں؛ بل کہ وہ میری قوم مسلم کی ملکیت ہے، جس نے اپنے لہو سے اُس کی خاک کو سینچا ہے۔ یہودی اپنی لاکھوں کی رقم اپنے پاس رکھیں۔(۱)

کچھ مؤرخین نے سلطان عبد الحمیدؒ کی یہودی نمایندے سے گفتگو کو اِن الفاظ میں نقل کیا ہے:

''اپنے ملکِ فلسطین کے تعلق سے جس کے ایک ایک بالشت کو اپنے اجداد کے خونِ گرم کے صرفے کے ذریعے حاصل کیا ہے، ہم ایک بالشت زمین کے تئیں کبھی کسی کوتاہی کو راہ نہ دیں گے، بل کہ ہم تو، ماضی سے زیادہ اپنا خون دے کر، اُس کی حفاظت کریں گے۔ ہم کسی طور وہاں یہودیوں کی ریاست قائم ہونے نہیں دیں گے۔'' (۲)

سقوطِ خلافتِ عثمانیہ کے منصوبے:

سلطانؒ نے اس کے بعد بیت المقدس کی حفاظت کے لیے، کئی ٹھوس اقدامات کیے، وہاں یہودیوں کی ہجرت اور آباد کاری کو باقاعدہ فرمان کے ذریعے روک دیا، نیز بیت المقدس کو انتظامی طور پر، شام سے علاحدہ کر کے، بہ راہ راست اپنے انتظام میں لے لیا؛ تا کہ یہودیوں کی کسی بھی سازش سے فی الفور نمٹا جا سکے۔ (۳)

سلطان کا ایک بہت بڑا ''گناہ'' اہلِ صلیب و قاتلانِ انبیا یہود کو پہلے سے ہی کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا کہ وہ فرزندانِ تثلیث کے اپنے دور میں بڑھتے ہوئے استعماری عزائم اور عالمِ اسلام کے خلاف، اُن کی ریشہ دوانیوں کی راہ روکنے کے لیے، اسلامی اتحاد و اجتماعیت و اشتراک کے بہت بڑے داعی اور سپاہی تھے(۴)؛ اب یہ دوسرا خطرناک ''گناہ'' اُن سے سرزد ہو گیا کہ انھوں نے صلیبیوں اور صہیونیوں کے عزائم کی راہ روکنے کی کوشش کی؛ لہٰذا خداوندانِ مغرب کے لیے انہیں اور اُن کی ''خلافتِ عثمانیہ'' کو معاف کر دینے کی راہ مکمل طور پر مسدود ہو چکی تھی؛ چناں چہ اُسی وقت سے نہ صرف سلطان عبد الحمید کو تختِ سلطنت سے اتار دینے، انہیں اذیّت ناک تنہائی کی زندگی میں مر جانے؛ بل کہ خلافتِ عثمانیہ کے بالکلیہ خاتمے کی محکم اور دوررس منصوبہ بندی کر لی گئی۔ ''ہرزل'' نے صاف لفظوں میں کہا:

''فلسطین میں یہودیوں کے لیے، اہلِ مشرق کی طرف سے دروازوں کے وا ہونے کی پہلی شرط یہ ہے کہ خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ ہو'' (۵)۔

---

(۱) رسالہ ''التبیان'' قاہرہ، شمارہ ۳۸، جلد ۴، ص: ۴۴، کالم ۳، مضمون: ''ریاست خلافت عثمانیہ، دور فاتحین'' بہ قلم: ڈاکٹر ''رضا طیب''۔

(۲) ''فتوی علماء المسلمین بتحریم التنازل عن ای جزء من فلسطین'' شائع کردہ ''جمعیۃ الاصلاح الاجتماعی'' کویت، پہلی اشاعت ۱۴۱۰ھ/۱۹۹۰ء، ص: ۱۰)...... (۳) حوالۂ سابق

(۴) التبیان، شمارہ ۳۹، جلد ۴، ص: ۲۲، کالم ۳۴۔

(۵) فتوی علماء المسلمین، ص: ۱۰۔

یہ کام یہودیوں کی ماسونی تحریک اور ڈونمہ (۱) یہودیوں نے اپنے سر لیا۔

(۱) یہ وہ یہود ہیں، جو عہد اسلامی میں اندلس میں رہتے تھے، صلیبیوں کے وہاں برسر اقتدار آ جانے کے بعد، وہاں کی زمین ان کے لیے تنگ ہوگئی، تو یہ سلطنت عثمانیہ کی حدود میں یونان کے "سالونیک" شہر میں آکر آباد ہوگئے، جو سلطنت عثمانیہ کی حدود حکم رانی میں تھا۔ انہوں نے بعد میں مسلمان ہو جانے کا مظاہرہ کیا۔ ان کا قائد خبیث النفس یہودی "شبتارے زیفی تھا" جس نے ۱۷ ویں صدی عیسوی میں "مسیح منتظر" ہونے کا دعوی کیا اور کہا کہ وہ یہودیوں کی قیادت کرے گا، ساری دنیا پر فلسطین سے حکم رانی کرے گا اور شہر قدس کو یہودی ریاست کا دار الحکومت بنائے گا۔ اس کے یہ خیالات شدہ شدہ یہودیوں میں رواج پانے لگے؛ چناں چہ مختلف خطوں سے یہودیوں کے وفود کی اس کے پاس آمد شروع ہوگئی۔ یہودیوں نے تاج شہنشاہی پہنا دیا؛ لیکن اس سے دگر علمائے یہود بہت چراغ پا ہوئے اور اس کے خلاف، ان کی تگ و دو شروع ہوگئی، بالآخر ترکی کے صدر اعظم "احمد کوبریللی" کو اس کی اطلاع مل گئی۔ انہوں نے اس کو گرفتار کرلیا، اس پر مقدمہ قائم ہوا، قاضی نے اس سے عدالت میں کہا: تم مسیح موعود ہونے کے قائل ہو، تو ہمیں اپنا معجزہ دکھاؤ، اس کے ایک صورت یہ ہے کہ ہم تمہارے کپڑے اتار دیتے ہیں اور ہم تمہارے اوپر تیر چلاتے ہیں، اگر یہ تیر تمہارے جسم میں پیوست نہ ہوئے تو سلطان تمہارے مسیح موعود ہونے کے دعوے کو تسلیم کرلیں گے۔ زیفی کو اس وقت دن میں تارے نظر آنے لگے۔ اس نے فوراً سارے الزامات مسترد کردیا کہ یہ ان کے خلاف بہتان ہیں۔ اس سے مسلمان ہو جانے کی پیش کش کی گئی، اس نے بہ ظاہر اسلام قبول کرکے اپنا نام "محمد عزیز افندی" رکھ لیا۔ اس نے عثمانی حکام سے یہودیوں کو اسلام کی دعوت دینے کی اجازت طلب کی، جو منظور کرلی گئی۔ اس نے یہودیوں کو سمجھایا کہ بہ ظاہر اسلام قبول کرلو اور بہ باطن اپنے مذہب پر قائم رہو۔

"یہود دونمہ" جو اسی آدمی کے پیرو تھے، اسلام اور اسلامی اقدار کی بیخ کنی کے لیے کمر بستہ ہوگئے۔ الحاد، آزادی رائے، مغربی طرز زندگی کی دعوت، عورتوں کو بے حجابی پر آمادہ کرنے اور مدارس و جامعات میں مرد و زن کے اختلاط کی حوصلہ افزائی جیسے کارنامے انہی یہودیوں نے عثمانی معاشرے میں انجام دیے۔ سلطان عبد الحمید کے خلاف بغاوت اور ہمہ گیر دشمنی کی آگ انہی نے فروزاں کی۔ انہی میں سے اکثر لوگ انجمن "اتحاد و ترقی" کے ارکان تھے۔ ان کے خلاف ساری تحریکیں، مظاہرے اور بغاوتیں انہی نے منظم کیں۔ یونان کے "سالونیک" سے اٹھی آندھی سے "آستانے" میں جو تباہی مچی، اس کے پیچھے یہی لوگ تھے۔ انہوں نے ترکی افواج میں اختلاف و انتشار کا بیج بویا، جوانوں کو بغاوت و سرکشی پر آمادہ کیا، لوگوں کے افکار و خیالات کو مسموم کیا، نشر و اشاعت کے اداروں پر قابض ہوگئے، بینکوں اور مالی اداروں پر ان کا تسلط ہوگیا، تجارت و اقتصادیات انہی کے قبضے میں آگئے اور عثمانی سلطنت کے سارے شعبوں اور زندگی کے سارے گوشوں پر ان کی گرفت مضبوط ہوگئی۔ (دیکھیے: التبیان، شمارہ ۳۹، جلد ۴، ص: ۲۱، کالم: ۳، ص: ۲۲، کالم: ۱)

سلطان عبد الحمید ثانی کو طرح طرح سے گھیرنے اور سلطنت عثمانیہ کو مغربی طرز حکومت کی راہ پر ڈالنے کے لیے، بہت سی جماعتیں اور تنظیمیں معرض وجود میں آئیں، جن کا سہرا پردے کے پیچھے سے یہودیوں اور فرزندان تثلیث ہی کے سر جاتا تھا۔ یہ تنظیمیں ٹوٹتی بکھرتی رہیں اور نئے نئے ناموں سے دوبارہ بنتی رہیں۔ سب سے آخر میں جمعیت "اتحاد و ترقی" بنی، جس کی اساس تمام تر اسلام دشمنی اور قومی طورانی تہذیب کے احیا پر رکھی گئی۔ ماسونی یہودی تحریک کے ارکان اور مغرب پرست ترک اس میں پیش پیش تھے۔ طورانی تہذیب کے احیا کے نظریے کا بانی بھی ایک یہودی "موئیز کوہین" تھا۔ اس نے ترکوں کے ذہنوں میں اس نظریے کی آب یاری کے لیے انتھک محنت کی؛ تاکہ ترکوں کو اس مے گل گوں سے بدمست کردینے کے بعد اسلام سے ان کے رشتے کو کاٹنا آسان ہو۔ "اتحاد و ترقی" نے شروع دن سے نسل پرستانہ نعروں سے ترکوں کو سرشار کرنا شروع کیا اور شہری آئین، استبداد سے جنگ آزادی کی بحالی وغیرہ مغرب سے برآمد کردہ خیالات کی دھن پر نچانا مشغلہ بنالیا، جس کا بنیادی مقصد سلطان عبد الحمید کو راہ سے ہٹانا، خلافت کا خاتمہ اور سلطنت عثمانیہ کی قبا چاک کردینا تھا۔

جمعیت "اتحاد و ترقی" نے، یہودی تحریکوں کی مدد سے ۱۹۰۹ء میں زبردست شورشیں بپا کیں، جن کا مقصد سلطان عبد الحمید کو بہ ہر صورت معزول کردینا تھا، ان شورشوں کو دبانے کے لیے سلطان نے طاقت کا استعمال کیا، جس کے لیے وہ مجبور تھے، اس کے نتیجے میں "اتحاد و ترقی" کے متعدد اہل کار ہلاک ہوگئے۔ اس کو بہانہ بنا کر اس انجمن کے عسکری بازو نے، یہودیوں کی مدد سے یونان کے "سالونیک" شہر سے "آستانے" پر دھاوا بول دیا، جو سلطنت عثمانیہ کا پایہ تخت تھا اور سلطان کو ان کے سارے مذہبی و شہری اختیارات سے بے دست و پا کرکے معزول کردیا، معزولی کی اطلاع سلطان تک پہنچانے کے لیے، اس جمعیت نے جو چار رکنی کمیٹی تشکیل دی تھی، اس کا سربراہ اور ترجمان بھی یہودی "ایمانوئیل قرہ صو" تھا، یہ اسپینی یہودی تھا اور مقدونیا کی مجلس ماسونی کا ہیڈ ماسٹر تھا، اس نے شاہ کے خلاف شورشوں کو ہوا دینے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا، شاہ نے اس کو اپنے قلم رو سے دھتکار بھی دیا تھا؛ لیکن مقدور کی بات کہ یہی ملعون آج "فرمان معزولی" پہنچانے آیا تھا!۔

سلطان کو ۱۹۰۹ء میں معزول کیا گیا۔ ان کے بعد ۱۹۲۴ء تک نام کی خلافت قائم رہی؛ لیکن اسلامی اقدار و روایات کو اس اثنا میں بالکل ختم کردیا گیا اور رہی سہی کسر ۱۹۲۴ء میں مصطفیٰ کمال اتاترک (م ۱۳۵۳ھ/۱۹۳۴) کو جمہوریہ ترکی کا باقاعدہ صدر اعلان کیے جانے کے ساتھ ہی پوری کردی گئی۔ سلطان عبد الحمید ثانی، سلطنت عثمانیہ کے آخری "مرد ہونہار" تھے، ان کا زوال، درحقیقت خلافت عثمانیہ کا زوال ثابت ہوا، چناں چہ ان کے بعد دو خلیفہ ہوئے، ان کے دور میں خلافت کے لاشہ بے جان کی تجہیز و تکفین کا انتظام کیا جاتا رہا، تا آں کہ مصطفیٰ کمال نے ۱۹۲۴ء میں اس کی تدفین کا اعلان کردیا۔

عربوں میں قومیتِ عربیہ کا بیج بویا گیا:

دوسری طرف انگریزوں نے، اِس سلسلے میں بھرپور کردار ادا کیا، جنہوں نے عربوں کو عثمانی سلطنت کے خلاف یہ کہہ کر اُکسایا کہ عثمانی تمہاری زبان، تمہارے کلچر اور تمہاری تہذیب کے حوالے سے امتیازی برتاؤ کر رہے ہیں۔ عثمانیوں کے خلاف یہ سراسر بہتان تھا اور دوررس سازش کا ایک حصہ۔ اِس مشن کو ایک انگریزی فوجی افسر اور اور اہلِ قلم ''لورینس'' Lawrence (۱۸۸۸-۱۹۳۵ء) نے بڑی محنت، ہوشیاری اور لگن سے انجام دیا۔ یہ شخص انگریزوں اور عربوں کے درمیان رابطہ افسر اور عربوں میں برطانیہ کا انٹلی جنس کمشنر تھا۔ جنگِ عظیم اول اور اُس کے بعد امیرِ مکہ شریف حسین (۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴-۱۳۵۰ھ/۱۹۳۱ء) کی اِمارت کے علاقوں میں برسرِ عمل رہا۔ ۱۹۱۶ تا ۱۹۱۸ء تو بہ طورِ خاص اُس نے عربوں کو ترکوں کے خلاف بھڑکانے کا فریضہ، اِس شدّ ومد سے انجام دیا کہ عالمی صحافت میں اُس وقت اُس کا نام ہی ''عربوں کا بے تاج بادشاہ'' پڑ گیا تھا۔ اُس نے واضح طور پر اعلان کیا تھا کہ ''ہمارا بنیادی مقصد ہی، اِسلامی اِتحاد کو پارہ پارہ کرنا اور سلطنتِ عثمانیہ کی بیخ کنی کرنا ہے'' نیز اُس نے صاف صاف کہا تھا:

''اگر ہم عربوں کو ترکوں سے اپنا حساب بہ یک وقت اور سختی کے ساتھ بے باق کرنے پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں، تو ہم ہمیشہ کے لیے اِسلام کے خطرے کا سدِّ باب کرلیں گے۔ اِس طرح ہم مسلمانوں کو اپنے خلاف لڑنے اور داخلی انتشار پر آمادہ کردیں گے۔ وہ خانہ جنگی کا شکار ہوجائیں گے، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ترکی میں مسلمانوں کا ایک خلیفہ ہوگا اور اسلامی عربی دنیا میں دوسرا ہوگا۔ دونوں مذہبی خانہ جنگی میں مصروف رہیں گے۔ اس کے بعد ہمیں اسلام سے کوئی خوف کبھی نہ ستائے گا۔''

ایک ہولناک سازش جنگ عظیم اول اور خلافت کے خاتمہ کا آخری حربہ:

عالمی استعماری کے اِن ماہر کھلاڑیوں نے ۱۹۱۴-۱۹۱۸ء میں جنگِ عظیم اول کی آگ دہکائی، جس میں جرمنی اور اُس کے اتحادی ایک طرف اور برطانیہ، فرانس اور روس دوسری طرف تھے۔ عربوں کی ہم دردی برطانیہ کے ساتھ تھی؛ کیوں کہ اُس نے عرصے سے عربوں کے احمقوں کو یہ باور کرا رکھا تھا کہ برطانیہ اُن کا ہم درد ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ برطانیہ کے ساتھ یہودی بھی لڑ رہے تھے۔ سلطنتِ عثمانیہ یہودیوں کی دوررس سازش کے نتیجے میں وہ امورِ سلطنت میں در آئے تھے اور اِلحاد اور اسلام بے زاری کی عثمانی معاشرے اور ترکوں کی سوسائٹی میں تخم ریزی کر چکے تھے، بے وجہ جرمنی کے ہم نوا فریق کے طور پر؛ اِس جنگ میں دھکیل دیا گیا۔ اِس جنگ میں حسبِ توقع جرمنی کی شکست ہوئی، جب کہ برطانیہ اور اُس کے اتحادی فتح مند رہے۔

برطانیہ کی جانب سے فلسطین میں یہودیوں کے لیے قومی وطن قائم کرنے کے وعدے کو پورا کرنے کا آغاز:

۱۹۱۶ء میں برطانیہ کے وزیر خارجہ ''آرتھر جیمس بالفور'' (۱۸۴۸-۱۹۳۰ء) نے یہودیوں کے لیے، فلسطین میں قومی وطن قائم کرنے کا وعدہ جاری کر دیا، جو ''وعدۂ بالفور'' کے نام سے مشہور ہے۔(۱) انتداب کے اس پورے دور میں، ساری دنیا سے یہودیوں کو فلسطین میں عموماً اور شہرِ قدس میں خصوصاً: لا بسانے کی کوشش کی گئی۔ فرزندانِ تثلیث نے فلسطین کو صہیونیوں کے حوالے کرنے کے لیے ہر طرح کی معنوی و مادّی مدد کی۔ یہودیوں کو شہرِ قدس میں اپنے نام نہاد تاریخی و مذہبی حق کا پروپیگنڈا کرنے اور دنیا کو یہ بتانے اور جتانے کی کوشش پیہم کے لیے ہر طرح اکسایا گیا اور بالآخر ۱۹۴۸ء میں اقوام متحدہ کے ذریعے فلسطین میں یہودی مملکت کے قیام کا اعلان کروا دیا گیا۔

اسرائیل عرب جنگیں، امریکہ اور برطانیہ کا کھلم کھلا اسرائیل کا ساتھ دینا:

۱۹۴۸ء، ۱۹۶۷ء اور ۱۹۷۳ء میں اسرائیل کے ساتھ عربوں کی تین جنگیں ہوئیں۔ تینوں میں امریکہ، برطانیہ اور صلیبی یورپ نے، اسرائیل کا کھلم کھلا ساتھ دیا۔ عسکری، معاشی اور ہر نوع کی مادّی و معنوی مدد دی۔

---

(۱) ''وعدۂ بالفور'' (Balfour Declartion) ۲ رنومبر ۱۹۱۷ء میں جاری ہوا۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہودیوں کے حوالے سے، برطانوی اہلِ صلیب کا فعال کردار، اسی زمانے سے روبہ آنا شروع ہوا؛ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ برطانیہ اس سے بہت پہلے صہیونیوں کی فلسطین میں آمد اور اُن کی حمایت کے لیے سرگرم رہا تھا؛ چناں چہ جولائی ۱۸۳۸ء میں ہی برطانیہ نے شہر ''قدس'' میں اپنا کونسلیٹ قائم کرلیا تھا، اور اُس وقت اُس نے یہ اعلان بھی کیا تھا کہ اس اقدام سے جہاں اُس کا مقصد اپنے مفادات کی حفاظت ہے، وہیں ایک بڑا مقصد اس شہر میں یہودیوں کو تحفظ دینا بھی ہے (القدس الشریف، حقایق التاریخ وآفاق المستقبل، از ڈاکٹر محمد علی حلہ، شائع کردہ رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ ۱۴۲۱ھ ص:۲۰، بہ حوالہ Parkes,James:AHistoryofjewishpeople,London1984,P.183

باوجودے کہ خلافتِ عثمانیہ کے آئین میں واضح الفاظ میں یہ دفعہ موجود تھی کہ شہر قدس اور اُس کے نواح میں یہودیوں کو کوئی زمین فروخت کی جاسکتی ہے نہ کسی اور طرح سے دی جاسکتی ہے؛ لیکن برطانیہ نے خلافتِ عثمانیہ پر زبردست دباؤ ڈال کر اِن آئین میں ترمیم کرادی اور یہودیوں کے لیے نہ فلسطین میں زمین وجائے داد کے حصول کی راہ کھول دی؛ بل کہ شہر قدس کے دروازے بھی اُن کے لیے وا ہوگئے؛ چناں چہ برطانیہ ہی کی سفارتی کوششوں کے ذریعے یہودی ''موسی مونٹفیوری'' (Mosy Montefiori) نے ۱۸۵۵ء میں قدیم شہر ''قدس'' کی فصیل سے باہر اس بہانے عثمانی خلیفہ سلطان عبدالحمید اول (۱۲۵۵/۱۸۳۹ء-۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء سے) زمین خریدنے کے اجازت نامے کے حصول میں کام یاب ہوگیا کہ وہ وہاں ہسپتال تعمیر کرنا چاہتا ہے؛ لیکن اس نے شاہی فرمان کے مطابق وہاں ہسپتال تعمیر نہ کرکے پہلا یہودی محلّہ آباد کیا، جو اُسی کے نام پر ''حی مونٹفیوری'' سے مشہور ہے۔ یہ یہودی شیطان ۱۸۴۹ء میں ''یافا'' اور ''قدس'' کے مابین بیرونِ قدس بھی شاہی فرمان ہی کے بہ موجب اراضی خرید چکا تھا اور اس سلسلے میں بھی دارالخلافہ ''استنبول'' میں برطانوی سفیر سے اُس نے مدد لی تھی۔ (الاطماع الصہیونیۃ فی فلسطین منذ النصف الثانی من القرن التاسع عشر، المؤتمر الثالث لتاریخ بلاد الشام: ج ۳/عمان ۱۹۸۳ء، بہ قلم: حسن ریان)

قابلِ ذکر ہے کہ فرانس کے اہلِ صلیب، اسلام و مسلمان دشمنی میں، برطانوی اہلِ صلیب سے ہمیشہ دو قدم آگے رہے تھے۔ اُنھوں نے مسلمانوں سے اپنی عداوت کے جذبے کو تسکین دینے کے لیے ۱۷۹۸ء میں ہی، فلسطین میں ایک ''یہودی کامن ویلتھ'' (Jewish common wealth) قائم کرنے کے لیے، ایک خفیہ منصوبہ تیار کیا تھا۔ مصر اور مشرق عربی پر قبضے کے بعد، نپولین بونا پارٹ (Napoleon Bona Parte) (۱۷۶۹-۱۸۲۱ء) نے جو ۱۸۰۴ء سے ۱۸۱۵ء تک شہنشاہ فرانس رہا، نے ۱۷۹۸ء میں جب وہ فرانسیسی افواج کی قیادت کر رہا تھا، سارے یہودیوں کو اس کے جھنڈے تلے جمع ہوکر اپنی کھوئی عظمت اور قدیم قدس کی تعمیر نو کی دعوت دی تھی۔ (حوالۂ سابق، ص ۱۹-۲۰، الصہیونیۃ والصراع الطبقی، از صادق جلال العظم، بیروت ۱۹۷۵ء، ص ۵۷

۱۹۶۷ء میں اسرائیل کا بیت المقدس پر قبضہ:

۱۹۶۷ء میں اسرائیل کا بیت المقدس پر قبضہ:

۱۹۶۷ء کی جنگ میں اسرائیل نے امریکہ اور برطانیہ کی واضح مدد کی وجہ سے، نہ صرف مصر وشام واردن کے جنگی ومعاشی اہمیت کے حامل علاقوں پر، بل کہ سارے شہرِ قدس پر مع مسجدِ اقصیٰ قبضہ کرلیا۔ یہودیوں اور صلیبیوں کے استعماری عزائم کے پشت پناہ ادارے "اقوامِ متحدہ" اور اُس کی نام نہاد "سلامتی کونسل" کے ذریعے، اَن گنت قرار دادیں پاس کروائی گئیں، جن میں سے کسی ایک پر بھی اسرائیل نے عمل نہیں کیا؛ کیوں کہ اُن پر اسرائیل سے عمل کروانا مقصود ہی نہ تھا؛ بل کہ ان کا واحد مقصد عربوں، مسلمانوں اور دنیا کی انصاف پسند رائے عامّہ کو (اگر دنیا میں مسلمانوں اور عربوں کے تئیں بھی انصاف پسندی کے کسی تصور کے پائے جانے کو تسلیم کرلیا جائے) بیوقوف بنانا تھا؛ اِسی لیے اسرائیل سے، کسی ایک بھی قرارداد کے تعلق سے، کبھی باز پُرس نہ کی گئی، چہ جائے کہ اُس کی گوش مالی کی جاتی۔

اسرائیل کو ایٹمی طاقت بنانے میں یورپ اور امریکہ کا اہم رول:

یہی نہیں؛ بل کہ برطانیہ، یورپ اور امریکہ نے اسرئیل کی پیہم مادی وعسکری مدد کے ذریعے؛ اُس کو عربوں کے بیچ ایک بڑی عسکری اور ایٹمی طاقت بنادیا۔ وہ عرصے سے اِس پوزیشن میں ہے کہ سارے عربوں کو بہ یک وقت مزہ چکھا کر؛ آس پاس کی عربی ریاستوں کو نگل سکتا ہے۔ اُس نے جب چاہا عراق کے ایٹمی ری ایکٹر پر حملہ کرکے اُس کو تباہ کردیا، اُس نے ابھی نومبر ۲۰۰۷ء میں شام کے خفیہ عسکری ٹھکانوں کو نشانہ بنایا، وہ اب ایران کے ایٹمی ری ایکٹروں کو؛ تنِ تنہا یا امریکہ کے ساتھ تباہ کرنے کی سوچ رہا ہے، وہ جب چاہتا ہے لبنان پر حملہ اور قبضہ کرکے ہزاروں باشندوں کو تباہ کردیتا ہے۔

فلسطینیوں پر ظلم وتشدد کا آغاز:

وہ بالخصوص ۱۹۶۷ء کے بعد سے ہی فلسطینیوں کو روزانہ جس طرح مار کاٹ رہا ہے، اُن کے رہائشی علاقوں کو جس طرح ایک بڑے عقوبت خانے میں تبدیل کیے ہوئے ہے، وہ جس طرح عمر، سن اور جنس کی تفریق کے بغیر فلسطینی بچوں، بوڑھوں، عورتوں اور مردوں کو روزانہ تہِ تیغ کررہا ہے اور مکانوں کو مکینوں پر ڈھاتا رہتا ہے اور جس طرح اُن کے خطّوں میں ہمہ گیر معاشی ناکہ بندی کے ذریعے، انسانی بحران پیدا کرتا رہتا ہے؛ یہ ساری چیزیں دنیا والے دیکھ رہے ہیں، اقوامِ متحدہ کے اندھے بہرے ذمّے داروں واہل کاروں کے علم میں لاکر یہ سب کچھ کیا جارہا ہے؛ لیکن اسرائیل کے خلاف تادیبی کارروائی تو درکنار، اہلِ صلیب بالخصوص امریکہ (جو جنگِ عظیم دوم ۱۹۳۹-۱۹۴۵ء کے وقت سے صہیونی ریاست کے قیام واستحکام کے حوالے سے، زیادہ پیش پیش ہے) اُس کے تئیں کوئی مذہبی قرارداد بھی پاس ہونے نہیں دیتا اور طاقت، سازش، دھونس اور عیاری کے ذریعے؛ وہ صرف صہیونی عزائم کی تکمیل کی شاہ راہ کی تعمیر میں جٹا رہتا ہے۔

۱۹۷۵ء تک عربوں کا اِس بات پر مکمل اتحاد رہا کہ اسرائیل کی ریاست ناجائز ہے اور اُس کو فلسطین سے ختم ہونا چاہیے۔ اگر اِس وقت عرب اور مسلمان، عسکری اور اقتصادی طور پر کمزور ہونے کی وجہ سے، اسرائیل کو ختم نہیں کرسکتے، تو کوئی حرج نہیں، مزاحمت کے جن طریقوں کو، اُس کے خلاف کام میں لاسکتے ہیں لاتے رہیں اور اُس وقت تک سرگرم کار رہیں جب تک اسرائیل کم از کم ۱۹۶۷ء میں قبضہ کردہ زمینوں سے دست بردار نہیں ہوجاتا۔

انور سادات کا اسرائیل کو تسلیم کرلینا:

لیکن ۱۹۷۵ء میں مصری صدر محمد انور سادات (۱۳۳۷ھ/ ۱۹۱۸ء - ۱۴۰۱ھ/ ۱۹۸۱ء) نے ریاستِ اسرائیل کا دورہ اور اُس کے بعد امریکہ کی سرپرستی میں، اُس کے ساتھ معاہدۂ امن کرکے، جس کے ذریعے، اُنھوں نے ریاستِ اسرائیل کو تسلیم کرلیا، عربوں کے اتحاد میں پہلی مرتبہ رخنہ ڈال دیا۔

اردن کا اسرائیل کو تسلیم کرنا اور ۲۰ لاکھ فلسطینیوں کا بے گھر ہونا:

اُس کے بعد اردن نے اسرائیل سے صلح کرلی، پھر ۱۹۹۱ء میں میڈریڈ (اسپین) میں تنظیمِ آزادیِ فلسطین اور اسرائیل کے درمیان مذاکرات کرائے گئے اور ۱۹۹۳ء میں معاہدۂ امن پر دستخط بھی ہوگئے۔ اِن معاہدوں میں نہ صرف اسرائیل کی ریاست کو باقاعدہ تسلیم کرلیا گیا؛ بل کہ ۱۵ سے ۲۰ لاکھ فلسطین سے اجاڑے بھی گئے، فلسطینی پناہ گزینوں کی واپسی، شہرِ قدس کی پوزیشن اور مسجدِ اقصیٰ وغیرہ جیسے بنیادی مسائل کے تعلق سے: مکمل خاموشی، اِبہام اور شاطرانہ اندازِ کار اپنایا گیا۔ اسرائیل اور امریکہ کی طرف سے سارے شہرِ قدس کو اسرائیل کی متحدہ ابدی راجدھانی- دار الحکومت بنائے جانے کی چال چلی جاتی رہی، جب کہ فلسطینی مذاکرات کاروں کی طرف سے لجاتے، شرماتے اور گھبراتے ہوئے صرف یہ کہا جاتا رہا کہ کم از کم مشرقی قدس (جس میں مسجدِ اقصیٰ واقع ہے اور جہاں عربوں کی گھنیری آبادی ہے) ہم فلسطینیوں کو عنایت کردیا جائے؛ تاکہ ہم اُس کو اپنی اُس فلسطینی ریاست کا دار الحکومت بناسکیں، جو ہنوز خواب وخیال سے زیادہ کچھ نہیں اور اسرئیل کی نیت یہی ہے کہ فلسطینی ریاست نام کی کوئی شے حقیقت کی زمین پر کوئی روپ دھار نہ سکے۔

مسجدِ اقصیٰ پر اپنے حق کا بدلیل دعویٰ اور ہیکلِ سلیمانی کے بلا دلیل باقیات کا غلط اور جھوٹا دعویٰ:

۱۹۶۷ء سے اب ۲۰۱۷ء تک اسرائیل نے شہرِ قدس کو یہودیانے، زمینی حقائق اور انسانی صورتِ حال کو تبدیل کردینے اور مزعومہ تاریخی حقوق کو اپنے حق میں ثابت کردینے کی ۹۹ فیصد کارروائی مکمل کرلی ہے۔ اُس نے مسجدِ اقصیٰ کی مغربی دیوار (دیوارِ بُراق) جس کو وہ "حَـائِـطُ الْـمَبْـكَى" دیوارِ گریہ کہتے ہیں اور ہیکلِ سلیمانی کی بلا دلیل باقیات بتاتے ہیں، کو مکمل طور پر قبضے میں کرلیا ہے، مسجدِ اقصیٰ کے نیچے سرنگیں کھود لی ہیں، مسجدِ صخرہ کو قبضے میں کرلینے کی کارروائی کو آخری شکل دے دی ہے۔ مسجدِ اقصیٰ تک پہنچنے میں روکاوٹیں پیدا کی جاتی ہیں، سیکورٹی کا سخت پہرہ ہے، مسجدِ اقصیٰ کے گرد یہودی آبادیوں کو گھنیرا کردیا گیا ہے، مسلمانوں کو بہ زورِ طاقت اجاڑا جاتا رہا ہے اور جو باقی ہیں اُنھیں اجاڑ دیے جانے کا واقعی خطرہ ستاتا رہتا ہے، مسجدِ اقصیٰ میں کسی بھی طرح اصلاح ومرمت بالکل ممنوع ہے۔

اسرائیل نے "فرِّق تَسُد" پر عمل کرتے ہوئے فلسطینیوں کو دو دھڑوں میں تقسیم کرکے اپنی راہ مزید آسان کردی ہے:

اسرائیل نے سب سے بڑی کامیابی یہ حاصل کرلی ہے کہ اُس نے اور اُس کے پشت پناہ امریکہ اور یورپ نے فلسطینیوں کو مکمل طور پر تقسیم کردیا ہے، وہ دو فریق بن گئے ہیں، عملاً دونوں ایک دوسرے سے فکری اور عملی سطح پر برسرِ پیکار ہیں: ایک فریق اسلام پسندوں اور دین داروں کا ہے، جس کو فلسطینیوں کی اکثریت اور پوری دنیا کے مسلم عوام کی حمایت حاصل ہے، جس کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ فلسطین کی آزادی کا خواب، صرف مزاحمت اور مقدور بھر جدوجہد آزادی وجہاد سے شرمندۂ تعبیر ہوسکتا ہے۔

حماس اور فتح میں بنیادی فرق:

اِس فریق کے نمائندوں میں سرِفہرست تحریک "حماس" ہے۔ دوسرا فریق سیکولر مزاجوں، بے دینوں، الحاد پسندوں، اسلام بے زاروں اور طرح طرح کے کھوکھلے نعروں والوں کا ہے، جو امریکہ واسرائیل اور مغرب کا کارندہ ہے، جس کو اقتدار، دولت اور دنیا کی عزّت کی خواہشِ بے پناہ نے اندھا، بہرا اور گونگا بنادیا ہے۔ اُس کو فلسطین، مسجدِ اقصیٰ اور خانماں برباد فلسطینیوں، شہیدوں، اَن گنت عزتوں کی پامالیوں، لاکھوں جوانوں، بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کی آہ وبکا اور صہیونی ریاست کی دہشت گردانہ کارروائیوں کی بھینٹ چڑھے لوگوں کی لاشوں کے ہمہ وقت اٹھائے جانے دل دوز مناظر سے کچھ لینا دینا نہیں، اُسے دنیا کی فانی لذت اور آنی جانی عزت واقتدار چاہیے اور بس! اِس فریق کے تنظیم آزادیِ فلسطین کے اکثر ذمّے دار اور اہلِ کار ہیں۔ امریکہ واسرائیل اور یورپ نے کمالِ چالاکی سے ثانی الذکر کو ہر طرح کی مالی واخلاقی وعسکری مدد کے ذریعے مضبوط کرکے، اول الذکر گروہ کے مدِ مقابل کردیا ہے اور ۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء کے صہیونی ڈرامے کے بعد سے (جو عربوں اور فلسطینیوں اور مسلمانوں کو بہ عجلت غلام بنالینے کے لیے اسٹیج کیا گیا تھا) بالخصوص اول الذکر کو دہشت گرد قرار دے کر عالمی پیمانے پر، اُس کو الگ تھلگ کردیا گیا ہے، جب کہ اپنے وطن اور اپنی زمین پر قابضوں کے خلاف جدّ وجہد، دنیا کے کسی کونے میں بھی دہشت گردی نہیں۔

حماس کی جیت کے باوجود مغرب کا تسلیم نہ کرنا اور دوہرا معیار اختیار کرنا:

حیرت کی بات ہے کہ وہ امریکہ اور یورپ جو جمہوریت کی علم برداری کے سب سے بڑے دعوے دار ہیں، فلسطینی اسلام پسندوں کی انتخابات میں بھاری اکثریت سے جیت کے باوجود، اُس کی حکمرانی کو اِس لیے گوارا نہ کرسکے کہ وہ جہاد ومزاحمت کی اپنی پالیسی کو ترک کرنے، دشمن ریاست کو ماننے اور قضیہ فلسطین کے تعلق سے، اُس اُصول واَساس سے دست بردار ہونے کے لیے ہرگز تیار نہیں، جس سے صرفِ نظر کرنے کرلینے کے بعد مسئلۂ فلسطین کوئی مسئلہ نہیں رہ جاتا اور صہیونی ریاست کے سارے عزائم کی تکمیل کی راہ یکسر ہم وار ہوجاتی ہے۔

حماس اور فتح میں بنیادی فرق:

فتح کی غزہ سے بے دخلی:

چناں چہ خادم حرمین شریفین شاہ عبداللہ بن عبدالعزیز کی وساطت سے دونوں فلسطینی فریقوں میں صلح صفائی کرادی گئی تھی، مکہ مکرمہ بلا کر دونوں سے متحدہ قومی فلسطینی حکومت کی تشکیل کے چارٹر پر دستخط لے لیے گئے تھے؛ لیکن اسرائیل اور امریکہ یورپ کے مفادات کے، یہ کارروائی بھی بالکلیہ خلاف تھی؛ اس لیے ان معقولوں نے اِس کوشش کو بھی مسمار کر دیا اور بالآخر سیکولر فریق، یعنی محمود عباس ومحمد دحلان کی جماعت اور تحریکِ حماس دونوں کو خانہ جنگی میں مبتلا کر دیا۔ حماس کے جاں بازوں نے محمود عباس کی ''فتح کی'' تحریک کے کارندوں کو رگید دیا اور حماس ''غزہ'' کے علاقے پر جون ۲۰۰۷ء میں قابض ہوگئی۔ اور اب ۲۰۰۷= ۱۴۲۸ھ کے اواخر میں بھی یہی صورتِ حال قائم ہے۔

غزہ کی ناکہ بندی:

لیکن چوں کہ حالات کی یہ کروٹ اسرائیل وامریکہ ومغرب اور اُن کے ہم نوا عرب حکمرانوں کی مرضی ومفاد کے بالکل برعکس ہے؛ اس لیے ایک طرف تو غزہ کے علاقے اسرائیل کی طرف سے بالعموم اقتصادی ناکہ بندی اور ہمہ گیر بائیکاٹ کے ذریعے، وہاں شدید انسانی بحران پیدا کر دیا گیا ہے، سیکڑوں بچے اور بیمار دوا وعلاج اور لقمۂ زندگی سے محروم ہوجانے کی وجہ سے روزانہ لقمۂ اجل بن رہے ہیں۔ دوسری طرف نہ صرف فتح تحریک اور محمود عباس کی طرف سے حماس والوں کو طرح طرح سے ستایا جا رہا ہے؛ بل کہ اسرائیل کو امریکہ ومغرب کی مادی ومعنوی امداد اور اُن کے طرف دار عربی ملکوں کی تائید کے ذریعے غزہ کے سارے باشندوں کو عموماً اور حماس کے اہل کاروں اور ذمے داروں کو خصوصاً تہ تیغ کرتے رہنے اور اُن کے خلاف منظم عسکری کارروائی روبہ عمل لاتے رہنے کے لیے کھلی اجازت دے دی گئی ہے۔

معاہدات کا دھوکہ دے کر مزاحمتی تحریک کو کچلنے کی سازش:

اِس مقصد کے تحت کئی کانفرنسیں اور میٹنگیں ہو چکی ہیں، ایک کانفرنس امریکہ کے ''اینا پولس'' مقام پر ۲۷/۱۱/۲۰۰۷ء کو ہوئی ہے، جس میں امریکہ، اسرائیل ومغرب کے ساتھ متعدد عربی ممالک کے نمائندوں نے شرکت کی۔ اِس کانفرنس میں جہاں محمود عباس کے لیے مادی امداد اور سیکورٹی کے استحکام وغیرہ کا وعدہ کیا گیا، وہیں اسرائیل کو حماس تحریک اور مزاحمتی گروہ کا صفایا کر دینے کی مکمل اجازت دے دی گئی۔ دوسری طرف محمود عباس سے شہر قدس فلسطینی پناہ گزینوں کی عدمِ واپسی اور مسجدِ اقصیٰ سے دست برداری کے حوالے سے مزید عملی پیش رفت کا وعدہ وارادہ حاصل کر لیا گیا۔ مذکورہ کانفرنس کے عمل کو آگے بڑھانے کے لیے دوشنبہ ۶/ذی الحجہ ۱۴۲۸ھ - ۱۷/دسمبر ۲۰۰۷ء کو فلسطین کو امداد دینے'' کے عنوان سے، پیرس میں یک روزہ کانفرنس کی گئی، جس میں دنیا کے ۹۰ وفود نے شرکت کی، اِس کا مقصد محمود عباس کے گروہ کو مدد دے کر حماس اور دیگر اسلام پسندوں پر شکنجہ کسنا تھا۔ اِس کانفرنس میں ۶۸/ملکوں اور تنظیموں کی طرف سے ۷/ارب ڈالر کی امداد دینے کا وعدہ کیا گیا۔ چوں کہ اس کا مقصد بھی صہیونی عزائم کے بہ روئے کار آنے کی راہ ہموار کرنی اور تحریکِ مزاحمت کو کچلنا تھا؛ اس لیے حماس نے امداد دینے کے اِس وعدے کو اپنے خلاف اعلانِ جنگ قرار دیا ہے۔ (فلسطین کسی صلاح الدین کے انتظار میں: ص ۳۲ تا ۴۵)

حالاتِ حاضرہ کے تناظر میں مسلمانوں کا سب سے حساس مسئلہ قضیہ فلسطین ہے، لہٰذا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس قضیہ سے متعلق مکمل واقفیت رکھے۔ مذکورہ صفحات میں اجمالی بحث کے بعد اب اس کی تفصیل بیان کی جارہی ہے اور یہ ثابت کیا جارہا ہے کہ فلسطین پر صرف اور صرف مسلمانوں کا ہی ہر اعتبار سے حق ہے اور اسرائیل ظالم اور ظلام ہے، تو آیئے مکمل تفصیل کے ساتھ اسے جاننے کی کوشش کرتے ہیں:

فلسطین کے سقوط کی کہانی بالتفصیل:

فلسطین کے سقوط کی کہانی بالتفصیل:

عالمی صہیونی تنظیم سوئزر لینڈ کے پال شہر میں ۱۸۹۷ء میں ٹیوڈار ہرزیل (Tuder Herzel)(۱۸۶۰-۱۹۰۴ء) کی قیادت میں، معرض وجود میں آئی۔ یہ شخص یہودی مجری رائٹر تھا۔ اس تحریک کا واحد مقصد مغربی استعماری منصوبے کو بہ روئے کار لانا تھا۔ پہلی جنگِ عظیم کے اختتام تک، اس کو کوئی خاطر خواہ کام یابی نہ مل سکی۔ یہ خالص نسلی تحریک ہے، جو مذہبی قومی یہودی میراث کے پس منظروں اور پیش منظروں کی اساس پر قائم ہوئی تھی۔ اس کام یابی کی واحد ضمانت، فلسطین میں عرب مسلمانوں کے وطنی حقوق کو سلب کرکے، ان کی جگہ یہودیوں کو لا بسانے میں کام یابی کا حصول ہے۔

صہیونی نظریے کی روح کے اعتبار سے، یہودیوں کے مختلف سیکولر، اشتراکی، مذہبی، ثقافتی، سیاسی اور لیبرل دھڑوں میں کوئی فرق نہیں، سارے یہودی بالآخر صہیونی ہیں، جن کا واحد مقصد ''بلند تر اہداف'' کا حصول ہے، یعنی فلسطین میں صہیونی ریاست کے تحت، سارے یہودیوں کا ازدحام اور عربی فلسطینیوں کی خانما بربادی۔

برطانوی کردار اور صہیونی قبضہ:

برطانوی سامراج نے ہی، صہیونی منصوبے کو برپا کرنے کی ذمے داری اپنے سر لی تھی، اسی نے ۱۹۱۷ء میں وعدۂ بالفور (آرثر جیمس Arthur James Balfour ۱۸۴۸-۱۹۳۰ء برطانوی سیاست داں جو برطانیہ کا وزیر اعظم اور وزیر خارجہ رہا تھا) کا اجرا کیا اور فلسطین میں یہودیوں کے لیے، ایک قومی وطن کی تعمیر کا اپنے آپ کو پابند عہد کیا، ۱۹۱۸ء میں برطانوی سامراج کا فلسطین پر قبضہ ہوا، اس وقت وہ اپنے اس وعدے کا پابند نہیں رہا کہ شریف حسین آزاد و مختار ہوں گے اور یہاں انھی کا عمل دخل رہے گا، چناں چہ برطانوی سامراج نے مئی ۱۹۱۶ء کے ''سائیکس پیکو'' معاہدے کے تحت شام و عراق کو اپنے اور فرانس کے درمیان تقسیم کرلیا، جس کی رو سے برطانیہ نے فلسطین کو عالمی خطہ قرار دینے کا منصوبہ بنایا، پھر اس نے فلسطین کو اپریل ۱۹۲۰ء کے ''سان ریمو'' معاہدے کے تحت اپنے لیے خاص کرلیا۔ فلسطین پر اپنے اقتدار کے تحت اس نے وعدۂ ''بالفور'' کو عملی جامہ پہنانے کی سوچی، جس کی قرارداد لیگ آف نیشنس نے ۱۹۲۲ء میں پاس کردی۔

فلسطین پر اپنے قبضے کے عرصے (۱۹۱۸-۱۹۴۸ء) میں برطانیہ نے فلسطین کی طرف پوری دنیا سے یہودیوں کے ترکِ وطن کرکے آبسنے کے دروازے چوپٹ کھول دیے۔ چناں چہ ۱۹۱۸ء میں یہودیوں کی جو تعداد ۵۵/ ہزار تھی وہ بڑھ کر ۱۹۴۸ء میں ۶/ لاکھ ۳۰/ ہزار ہوگئی، یعنی کل آبادی ۸/ فی صد کے تناسب سے بڑھ کر ۳۱/ فی صد کے تناسب تک پہنچ گئی۔

برطانیہ نے فلسطین کی زمین میں بھی ان کے حصے میں اضافہ کر دیا۔ پہلے انہیں فلسطین کی زمین کا ۲ر فی صد حصہ ملا ہوا تھا اب ۶،۷ فی صد حصہ مل گیا۔ یہ زمینیں یہودیوں کو برطانوی حکومت کی طرف سے ملی تھیں، یا غیر فلسطینی ہاتھوں سے حاصل ہوئی تھیں۔ ۳۰ر سال کی طویل مدت تک فلسطینی مسلمان حالات کی ساری ستم ظریفیوں کے باوجود، اپنی مٹی پر ڈٹے رہے، وہی یہاں کی غالب اکثریت رہے یعنی ان کا تناسب ۶۹ر فی صد رہا اور وہ زمین کے اکثر حصے ۳، ۹۳ فی صد کے مالک رہے؛ لیکن برطانوی استعمار کی تائید وحمایت سے یہودیوں نے اپنے اقتصادی ،سیاسی، تعلیمی، عسکری اور اجتماعی اداروں کو خوب مستحکم کرلیا۔ ۱۹۴۸ء تک وہ ۲۹۲ کالونیاں تعمیر کر چکے تھے۔ ۷۰ ہزار سپاہیوں پر مشتمل اپنی عسکری طاقت ترتیب دے کر، اپنی ریاست کے اعلان کی پوزیشن میں آچکے تھے۔

فلسطینیوں کی مزاحمت کا آغاز:

باوجودے کہ فلسطین کے خلاف سازش، فلسطینی عوام کی صلاحیتوں سے کہیں زیادہ بڑھی ہوئی تھی؛ لیکن فلسطینیوں نے برطانوی قبضے اور صہیونی منصوبے کو یکسر مسترد کرتے ہوئے آزادی کا مطالبہ کیا۔ الحاج امین الحسینیؒ ۱۳۱۱ھ ۱۸۹۳ء-۱۳۹۴ھ ۱۹۷۴ء کی سربراہی میں قومی وطنی دھارے یک جٹ ہو کر عوامی، سیاسی تحریکات اور زبردست انقلابی مساعی میں تبدیل ہوگئے؛ چناں چہ ۱۹۲۰ء میں ''براق'' انقلابی مظاہرے اور ۱۹۳۳ء میں احتجاجی مظاہرے برپا ہوئے، نیز مجاہد کبیر عزالدین قسام ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۲ء-۱۳۵۴ھ/ ۱۹۳۵ء کی قیادت میں جہادی تحریک کا آغاز ہوا اور کفِ احضر (سبز ہتھیلی) اور جہادِ مقدس کی تنظیم کی اساس پڑی۔

۱۹۳۶-۱۹۳۹ء کی زبردست انقلابی تحریک کے نتیجے میں، برطانیہ کو اپنے کتابِ ابیض (وہائٹ پیپر) بابت مئی ۱۹۳۹ء میں دس سال کے اندر فلسطینی ریاست کے قیام اور پانچ سال بعد فلسطین کی زمینوں کو یہودیوں کے ہاتھوں بیچنے، نیز فلسطین کی طرف یہودیوں کی مہاجرت کو روک دینے کا وعدہ کرنا پڑا۔

برطانیہ کی وعدہ خلافی:

لیکن ۱۹۴۵ء کے اواخر میں برطانیہ اپنے وعدے پر قائم نہ رہ سکا اور امریکہ کی سرپرستی میں صہیونی منصوبہ، پھر بہ روئے کار آنے لگا۔

اقوامِ متحدہ کی ظالمانہ قرارداد اور فلسطین کی تقسیم کا اعلان:

نومبر ۱۹۴۷ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے فلسطین کو دو ریاستوں عربی اور یہودی میں تقسیم کر دیے جانے کی قرارداد نمبر (۱۸۱) پاس کی۔ یہودی ریاست کو فلسطین کی ۵۴ فی صد اراضی، جب کہ عربی ریاست کو ۴۵ فی صد اراضی دیے جانے اور ایک فی صد اراضی، یعنی بیت المقدس کے خطے کو وقتی طور پر، عالمی خطہ قرار دیے جانے کی تجویز پاس کی گئی۔

جنرل اسمبلی کی قراردادیں، اقوام متحدہ کے چارٹر کی رو سے بھی، عالمی برادری کے لیے واجب العمل نہیں ہوتیں، علاوہ ازیں یہ قرارداد تو اُس اصول کے بھی خلاف ہے، جس پر اقوام متحدہ کی بنیاد ہے، یعنی یہ کہ اقوامِ عالم کو آزادی و خود مختاری کا مکمل حق ہوگا، نیز فلسطینی قوم سے، جس کا اس مسئلے سے راست تعلق تھا، کسی طرح کا مشورہ کیا گیا اور نہ اس سے رائے لی گئی۔

یہ قرارداد، اس لیے بھی ظالمانہ اور طرف دارانہ تھی کہ اس کی رو سے، آفاقی یہودی اقلیت کو، جو دوسری جگہوں سے ترکِ وطن کر کے فلسطین میں زبردستی آبسی تھی، فلسطین کی زمین کا بڑا اور بہتر حصہ دے دیا گیا تھا اور اصل مکینوں، یعنی فلسطینیوں کو فلسطین کا چھوٹا اور اس کی زمین کا اکثر ناقص حصہ دیا جانا تجویز کیا گیا تھا۔

فلسطین پر ظلم کے پہاڑ توڑے گئے:

غاصب اور ناجائز ریاست کے قیام کا اعلان (۱)، فلسطین پر ظلم کے پہاڑ توڑے گئے:

۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو صہیونیوں نے اپنی ریاست ''اسرائیل'' کے قیام کا اعلان کردیا۔ اس موقع سے برسرِ تصادم عربی افواج کو انھوں نے شکست دے دی؛ کیوں کہ یہ فوجیں بد نظمی، ناتجربہ کاری اور قیادت کی ناکامی کا اعلیٰ نمونہ تھیں۔ ان میں سے کچھ افواج استعمار کے زیرِ اثر تھیں اور اس کے افکار و خیالات کی مؤید۔ صہیونی فلسطین کی ۷۷ فی صد اراضی پر قابض ہوگئے۔ انھوں نے ۸ لاکھ فلسطینیوں کو، ان کے گھروں سے کھدیڑ دیا اور ۹ لاکھ ۲۵ ہزار یہودیوں پر مشتمل اپنی ریاست، فلسطینیوں سے چھینی گئی زمین پر قائم کرلی۔ مقبوضہ علاقے میں موجود ۵۸۵ فلسطینی گاؤں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا اور ۳۴ مقتل انھوں نے قائم کیے، جہاں فلسطینیوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کیا گیا۔ فلسطین کی باقی ماندہ زمین، یعنی مغربی کنارے کی ۵۸۷۸ مربع کلومیٹر کی زمین کو اردن نے باقاعدہ اپنی ریاست کا حصہ بنالیا، جب کہ غزہ پٹی کی ۳۶۳ مربع کلومیٹر کی زمین کو مصر نے اپنے زیرِ انتظام کرلیا۔

---

(۱) در در کی ٹھوکریں کھاتے رہنے کے بعد یہودیوں نے اور مسلمان دشمن مختلف النظریات والمذاہب قوموں اور افراد کے تعاون سے، جو انھوں نے (یہودیوں) اپنی چال بازی، مکاری، عیاری اور جوڑ توڑ کی بھیانک اور مجرمانہ صلاحیتوں کے ذریعے حاصل کی، کس طرح فلسطین میں زبردستی اور ظلم و جبر و ناانصافی کے تاریخ عالم کے تمام ریکارڈوں کو توڑتے ہوئے، اپنی جگہ بنالی اور پھر اپنی غاصبانہ ریاست قائم کرلی اور بالآخر فلسطین پر قبضہ کرکے، اصل مکینوں یعنی فلسطینیوں کو، اجنبی غریب الدیار بنادیا اور لاکھوں کو دیس سے نکال کر اور وہاں رہنے پر اصرار کرنے والوں پر، کس طرح ظلم کے پہاڑ توڑنے کی راہ ہموار؟ ان حقائق کے تسلسل کو مختصرا جاننے کے لئے، ذیل کی سطریں پڑھنا کافی ہے، توقع ہے کہ اس متن میں ذکر کردہ تفصیل کا اختصار قاری کے ذہن میں آسانی سے سمٹ آئے گا۔

حال آں کہ یہود و نصاریٰ میں تاریخ کے اکثر ادوار میں باہم نہ صرف فکری بل کہ ہر سطح پر تصادم کی کیفیت جاری رہی، لیکن مسلمانوں سے چو ں کہ یہودیوں کو دیرینہ پرخاش رہی تھی، اس لئے صلیبی جنگوں میں، یہودیوں نے کھل کر عیسائیں کا ساتھ دیا اور مسلمانوں کے خلاف، عیسائیں کے شانہ بشانہ لڑتے رہے، لیکن شیر اسلام حضرت صلاح الدین ایوبیؒ نے عیسائیں، رومیوں اور یہودیوں کو عبرتناک شکست سے دوچار کیا اور یہودیوں کو بھی عرب ممالک سے نکلنا پڑا اور یہ روس، جرمن، ہالینڈ، انگلینڈ اور فرانس منتقل ہوگئے۔ ان کی اکثریت خصوصا امیر یہودی برطانیہ میں مقیم ہوئے اور وہاں کی اقتصادیات، ناٹو، ڈیوکی محلاتی سیاست میں دخیل ہوئے، تاہم عوام کے غم و غصے کی تاب نہ لاتے ہوئی ۱۲۹۰ء میں برطانیہ سے بدر ہوئے۔

فلسطین پر ظلم کے پہاڑ توڑ دیے گئے:

فرانس پہنچے وہاں سے ۱۳۰۶ء میں نکالے گئے۔ بلجیم میں جمع ہوئے تو ۱۳۷۰ء میں چلتا کیے گئے، اس کے بعد انہیں کہیں مستقل ٹھکانہ میسر نہ آیا۔ چناں چہ چیکوسلواکیہ سے ۱۳۸۰ء، ہالینڈ سے ۱۴۹۴ء، روس سے ۱۵۱۰ء، اٹلی سے ۱۵۴۰ء اور جرمنی سے بھی ۱۵۵۱ء میں دیس نکالا ملا۔ یہ صدیوں خانہ بدوشوں کی طرح ادھر اُدھر پھرتے رہے آخر کیوں؟ صرف اور صرف اس لیے کہ یہ خود کو دنیا کی افضل ترین قوم سمجھتے تھے، دیگر معاشروں میں ضم ہونا انہیں منظور نہ تھا۔ مسلمانوں کے تو یہ ازلی دشمن تھے اور چوں کہ اس دور میں عرب ایک ترقی یافتہ، بہادر اور فاتح قوم تھے، اس لیے ان کو خوف سے کوئی بھی ملک انہیں ٹکنے نہیں دیتا تھا۔ لیکن جوں ہی مسلمانوں کا زوال شروع ہوا یہودی برطانیہ، فرانس، روس اور امریکہ میں قدم جماتے گئے۔

صیہونی تنظیم کے قیام کا پہلا قدم ''روم اور یروشلم'' نامی کتاب کو قرار دیا جانا چاہیے، جسے ایک یہودی منصف موسیٰ حیس نے ۱۸۶۲ء میں لکھا اور میں بھٹکتے یہودیوں کی قومیت کا احساس دلایا، انہیں مجتمع کرنے اور دوسری اقوام کے ساتھ مل جل کر رہنے کی ترغیب دی۔ دوسرا قدم یقیناً روسی یہودی منصف لیو پنسکر کی کتاب ''خود کار نجات'' کا ہے جو ۱۸۸۲ء میں شائع ہوئی۔ اس روسی یہودی نے اسی پر اکتفا نہیں کیا؛ بل کہ اپنی بھرپور کاوشوں سے ۱۸۸۴ء میں جرمنی میں یہودی نیشنل کانفرنس منعقد کی، جس میں الگ وطن کے لیے متعدد ضابطے ترتیب دیے گئے۔ ان ضابطوں میں دوسرے معاشروں میں مل جل کر رہنا، نئی نسل کو سائنسی تعلیم اور حکومتوں میں اچھی اسامیاں حاصل کرنا اور باعزت مقام پیدا کرنے پر زور دیا گیا۔ اس کانفرنس کے نتیجے میں ہر ملک، ہر شہر، جہاں یہودی آباد تھے، جماعتیں اور لیگیں بننے لگیں۔ روس میں ۱۸۸۷ء میں ''صیہون محبان'' پارٹی وجود میں آئی، اس کا تو پیغام ہی یہ تھا کہ یہودی زیادہ سے زیادہ فلسطین میں آباد ہوں؛ تاکہ وہاں مستقبل میں اپنا وطن قائم کیا جا سکے۔ اس کے تقریباً ۹ برس بعد ۱۸۹۶ء میں تھیوڈور ہرزل نامی یہودی نے ''یہودی ریاست'' کے عنوان سے کتاب لکھی جسے روس، امریکہ اور یورپ میں اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی کہ اس کے کئی ایڈیشن نکلے اور تھیوڈور ہرزل کو عظیم رہنما اور بڑے بڑے القاب سے نوازا گیا۔ حقیقتاً یہی وہ پہلا شخص تھا جس نے یہودی ریاست کا واضح خاکہ پیش کیا اور تمام عواقب وعوامل پر تفصیلاً بحث کی۔ جب تھیوڈور ہرزل کو انتہائی پذیرائی ملی، تو اس نے یہودیوں کے بین الاقوامی کنونشن کے لیے راہ ہموار کی اور بالآخر ۱۸۹۷ء میں سوئٹزرلینڈ کے شہر ''باسل'' میں یہودیوں کی پہلی عالمی کانفرنس کے متعدد اجلاس ہوئے جس میں یہودیوں کی ایک بین الاقوامی تنظیم تشکیل دی گئی جس کا نام یروشلم کے نزدیک ایک پہاڑی صیہون کے نام پر ''صیہونیت'' تجویز کیا گیا۔ صیہونیت کے بانی تھیوڈور ہرزل نے اس تنظیم کے لیے بہت سے پروٹوکول بھی بنائے، ایک فنڈ قائم کیا گیا جس کا نگراں یورپ کا بہت بڑا یہودی بینک کار لارڈ روکس چائلڈ مقرر ہوا۔ چائلڈ نے ہر یہودی پہ اپنی آمدنی کا ۲ فی صد یہودی بینکوں میں جمع کرانا لازم ٹھہرایا۔ بینکوں نے سود کا چکر چلایا اور یوں چند سالوں میں ہی صیہونیت کا فنڈ اربوں میں جا پہنچا۔

صیہونیت کو خطیر رقم میسر آئی، تو اسے وطن خریدنے کی سوجھی چناں چہ ۱۹۰۲ء میں ہرزل کی سربراہی میں ایک وفد سلطان عبد الحمید سے فلسطین میں اسرائیلی ریاست قائم کرنے کے لیے ترکی پہنچا؛ لیکن سلطان نے ان کی ہر بڑی سے بڑی پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ تاہم یہ فتنہ گر آرام سے نہیں بیٹھے، انہوں نے عربوں اور ترکوں کو باہم ٹکرانے اور برطانیہ سے مدد کا منصوبہ تیار کیا۔ پہلی جنگِ عظیم میں ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا؛ لیکن لارنس نے عربوں کو جھوٹے وعدوں کے ذریعہ برطانیہ کی مدد پہ آمادہ کر لیا۔ ایک عیار یہودی کیمسٹ ڈاکٹر ویزمین نے اپنی بارودی دریافت کے بعد بدلے برطانیہ کو زیرِ احسان کیا، جس کے نتیجے میں ''اعلان بالفور'' مرتب ہوا، جس کی توثیق فروری ۱۹۱۸ء میں فرانس، مئی ۱۹۱۸ء میں اٹلی اور ۱۹۲۲ء میں امریکہ نے کر دی۔ اس طرح گویا پوری مغربی دنیا، یہود کی پشت پناہ بن گئی اور یہی وہ دور ہے جب یہودیوں کے ایک خفیہ اجلاس میں باقاعدہ قرارداد کے ذریعے، یہ طے پایا کہ ''چوں کہ یہ دنیا اور اس کی ہر شے خدا کی ہے اور خدا صرف بنی اسرائیل کا ہے، اس لیے اس دنیا میں صرف ہم کو حکم رانی کا حق ہے۔''

فلسطین پر ظلم کے پہاڑ توڑے گئے:

یہاں ذرا لمحہ بھر کے لیے ضرور رُکیے اور سوچئے کہ ایک ایسی خانہ بہ دوش قوم جس کا کوئی مالک ہی نہ تھا، وہ اس وقت کی مضبوط ترین اقوام کی موجودگی میں دنیا پہ حکم رانی کی قرارداد پاس کر رہی ہے۔ مزید یہ کہ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے چند ''خودکار اسکیمیں'' بھی بنائی گئیں۔ مثلاً عالمی بینک کاری پر مکمل کنٹرول؛ ذرائع نشر و اشاعت، صحافت پر قبضہ؛ اپنی مرضی کی خبریں دینا اور من پسند لٹریچر کی تشہیر؛ مذاہب کے برعکس نئے تخریبی فرقوں کی تشکیل؛ جہاد کو جنگل کا قانون اور انسان دشمن جذبہ قرار دیا؛ کلیدی عہدوں پر فائز ہونا اور صنعت و تجارت پہ اپنی مکمل اجارہ داری۔ اگر چہ یہ قراردادیں ۱۹۰۱ء اور ۱۹۰۳ء میں تیار ہوئیں، تاہم تقریباً پندرہ سال بعد ۱۹۱۷ء میں منظر عام پر آئیں جب روس میں سرخ انقلاب آیا۔ جس کی قیادت لینن اور ٹرانسکی نے جو دونوں یہودی تھے۔ صرف یہی نہیں کارل مارکس بھی کٹر یہودی تھا اور اسٹالن بھی یہود نواز تھا۔ ان سب نے مل کر کمیونزم کی آڑ میں، جس طرح روسی مسلمانوں پر مظالم ڈھائے، اس کی مثال نہیں ملتی۔ عالمی بساط پہ یہود و نصاریٰ، روس اور ان کے حواری جھوٹ، مکر و فریب اور انسانیت کی تذلیل کا کھیل کھیلتے رہے اور بالآخر جنرل اسمبلی میں ۱۴ رمئی ۱۹۴۸ء کو چھ بج کر گیارہ منٹ پر امریکی اعلان کر دیا۔ اس کے فوراً بعد روس نے بھی تسلیم کر لیا اور یوں فلسطین کے قلب میں ایک سفید جھنڈا ابھرا، جس پر چھ کونوں والا نیلا تارا بنا ہوا تھا۔ بے شک یہ عالمی صہونیت کی پروپیگنڈہ مشینری کا کارنامہ تھا، جس میں دنیا کے ہر ملک، ہر شہر میں ہر یہودی مرد و زن نے عیاریوں، مکاریوں اور انسانیت سے بعید ترین مکروہ کردار ادا کیا، تب ہی تو اسرائیل وجود میں آیا۔ اسرائیل کا یہ شجر خبیث سامراجیوں کی شہ پہ جب سے لگا ہے تب سے اب تک، لاکھوں عربوں کا خون پی چکا ہے۔ طرفہ تماشا یہ کہ یہودی ۱۹۴۸ء والے اسرائیل پہ بھی قانع نہیں: بل کہ وہ تو دنیا پہ حکم رانی کے پہلے مرحلے کے لیے، عظیم تر اسرائیل کے مجوزہ خاکے کے مطابق، صحرائے سینا، نہر سویز کے دونوں کناری بہ شمول پورٹ سعید، قاہرہ، خلیج سویز اور بحیرہ احمر کا کچھ حصہ شمالی حجاز، نجد مع مدینہ، کویت، عراق، اردن، شام، لبنان اور ترکی کے جنوبی حصے، کو وارارات پر نیلا تارا چمکانا چاہتے ہیں۔

خود کو مہذب دنیا کی مہذب اقوام کہلانے والوں نے، فلسطین کو تقسیم کرنے اور اسرائیل قائم کرنے میں جس عجلت، ڈھٹائی اور بے انصافیوں کا مظاہرہ کیا، یقیناً قیامت تک ایسی مثال ملنا ناممکن رہے گا۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے فیصلے، خود اس کے دستور کے مطابق ان کا نفاذ لازم نہیں آتا، جب کہ اس مخصوص فیصلے میں تو حالت یہ تھی کہ خود اس ادارے کے بنیادی اصولوں کی خلاف ورزی کی گئی اور عوام سے ان کی آزادی اور خود اختیاری کا حق چھین لیا گیا۔ اس غیر منصفانہ فیصلے کے مطابق فلسطینیوں کی اکثریت کو نظر انداز کر کے یہودی اقلیت کو زمین کا ۵۴ فی صد حصہ عطا کیا گیا، جب کہ ان کے پاس اس وقت محض ۵/۶ فی صد زمین تھی اور وہ کل آبادی پر ۳۱ رفی صد تھے۔ تقسیم فلسطین کے اعلان کے ساتھ ہی، جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے۔ قلیل تعداد میں خود ساختہ ''جیش الانقاذ'' اور فلسطینی فوج ''الجہاد للقدس'' نے پہلے چھ ماہ بہت کامیابیاں حاصل کیں اور عرب ممالک کی طرف سے دیے گئے ناقص اسلحے کے باوجود، ۸۲ فی صد رقبہ بچا لیا۔ صرف مصر کی جماعت ''الاخوان المسلمون'' نے ہی فلسطین کے تحفظ کے لیے بہترین کوشش کی۔ ان کے رہنما مرشد حسن البناء نے اکتوبر ۱۹۴۸ء میں ہزاروں جاں بازوں کا دستہ روانہ کیا، ان میں سے گنتی کے مجاہدین مصری حکومت کی پابندیوں سے بچ کر پہنچے اور میدان جنگ میں انتہائی بہادری سے لڑے۔ سیکولر مصری حکومت نے لڑائی کے دوران ہی، بہت سے مجاہدین کو گرفتار کر کے، جیلوں میں ڈال اور اخوان المسلمون پر سخت پابندی لگا دی اور ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کے ساتھ جنگ بندی کے شرم ناک معاہدے سے، چند روز پہلے قائد اخوان حسن البناء کو شہید کر دیا۔ فرعونوں کی سرزمین میں فرعونیت سے نسبت جوڑنے والوں سے، نہ تب خیر کی امید تھی نہ اب ہے۔ (اسحاق طور، فلسطین اور قبلۂ اول کی آزادی، سہ روزہ دعوت، نئی دہلی، شمارہ ۸۴، جلد ۵۵)

اقوام متحدہ کا ایک اور گھناؤنا کردار، اسرائیل کی رکنیت تسلیم کرنا:

دوسری طرف اقوامِ متحدہ نے اس شرط کے ساتھ، اسرائیل کو اقوام متحدہ کا رکن تسلیم کرلیا کہ وہ خانماں برباد فلسطینیوں کو دوبارہ اپنے اپنے گھروں کو واپس آجانے کی اجازت دے دے گا؛ لیکن اسرائیل کو یہ بات نہ ماننا تھی اس نے نہ مانی۔

جمال عبدالناصر کی مجرمانہ خاموشی:

۱۹۴۸-۱۹۶۷ء کے درمیان کا عرصہ ''جنگ کی قومیت'' اور ''اتحاد ہی راہ آزادی ہے'' کا عرصہ رہا۔ جمال عبدالناصر (۱۹۱۸-۱۹۷۰ء) کی قیادت میں عربی حکومتوں نے اسرائیل سے تصادم کی طرف پیش رفت کی، قومی فلسطینی قیادت کا کردار اس اثنا میں پس گردی کا شکار رہا۔ عربی حکومتوں کے ہاں موثر طریقۂ کار، سنجیدگی اور اسرائیل سے فیصلہ کن جنگ لڑنے کے تعلق سے، سچے ارادے اور پکی عزیمت کی کمی تھی۔ حکمتِ عملی اور مرحلہ پسندی کے تحت، فلسطینی مزاحمت بھی شکست و ریخت کا شکار تھی، چناں چہ اس کے پاس کوئی جامع منصوبہ اور حکمتِ عملی نہ تھی، اس نے صرف عوامی جذبات کو بھڑکانے کا کام کیا اور اسی میں تمام تر انہماک کی وجہ سے، اس نے جنگ کی کسی تیاری کی بھی نہ سوچی۔ جب کہ نوخیز اسرائیلی ریاست، اپنے دست و بازو کو مسلسل مضبوط کیے جارہی تھی۔

عوامی مزاحمت اور تنظیم آزادی فلسطین:

۱۹۶۴ء میں، احمد شقیری کی صدارت میں تنظیم آزادی فلسطین کی بنیاد پڑی۔ اس کی اساس گزاری میں جمال عبدالناصر نے براہ راست مدد دی تھی؛ کیوں کہ انھیں یہ اندیشہ تھا کہ قضیہ فلسطین کی زمام اب ان کے ہاتھ سے نکلی جارہی ہے؛ کیوں کہ فلسطین میں ان دنوں خفیہ تحریکوں اور سرگرم تنظیموں کی باڑھ سی آئی تھی، خصوصاً ''فتح'' تحریک کا بڑا زور تھا، جو ۱۹۵۷ء میں معرضِ وجود میں آئی تھی۔ تنظیمِ آزادی فلسطین کا اصل ہدف ۱۹۴۸ء میں صہیونیوں کے ذریعے قبضہ کردہ زمین کی بازیابی تھی۔

اس کے چارٹر میں آزادی کی واحد راہ کے طور پر، مسلح جدوجہد پر ہی زور دیا گیا تھا۔ فلسطینیوں نے عام طور پر اس تنظیم کو خوش آمدید کہا؛ کیوں کہ عرصے کے بعد یہ قومی فلسطینی وجود کے دورِ افق پر، امید کی ایک کرن بن کر طلوع ہوئی تھی۔ ۱۹۶۸ء میں ساری رضا کارانہ فلسطینی تنظیمیں، جن میں سرِ فہرست ''فتح'' تحریک تھی، تنظیم آزادی فلسطین میں ضم ہوگئیں۔ ''فتح'' کے سربراہ یاسر عرفات نے فروری ۱۹۶۹ء سے تنظیم کی قیادت کی۔ ۱۹۷۴ء میں عربی حکومتوں نے اس تنظیم کو فلسطینیوں کی واحد قانونی نمایندہ تنظیم تسلیم کرلیا۔ اسی سال اقوام متحدہ میں، اس کو نگراں رکن کے طور پر نمایندگی دی گئی۔

جون ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں عربی حکومتوں کو زبردست ہزیمت سے دوچار ہونا پڑا۔ چند ہی روز میں فلسطین کے باقی ماندہ حصوں پر بھی اسرائیل نے قبضہ کرلیا۔ مغربی کنارہ جس میں قدس شریف داخل ہے، نیز غزہ پٹی، دونوں اسرائیل کے قبضے میں آگئے۔ ۳لاکھ ۳۰ ہزار فلسطینی خانماں برباد ہوگئے، نہ صرف یہ ہوا؛ بل کہ سیریا کے جنگی اہمیت کے حامل علاقہ گولان کی پہاڑی پر بھی اسرائیل نے قبضہ کرلیا، جس کا رقبہ ۱۱۵۰ مربع کلومیٹر پر پھیلا ہوا ہے، اسی طرح مصر کے اہم خطے، صحرائے سینا پر قبضہ کرلیا، جس کا رقبہ ۶۱۱۹۸ مربع کلومیٹر پر محیط ہے۔

فلسطین کی یہودی کاری اور فلسطینی پناہ گزینوں کا مسئلہ:

صہیونی ریاست نے فلسطینی زمینوں کو بہت زور وشور سے یہودیانے کا عمل نہ صرف جاری رکھا؛ بل کہ فلسطین کی اسلامی پہچان اور اس کے تہذیبی نقوش کو مکمل طور پر مٹا دینے کی کوشش کی، چناں چہ اس نے ۱۹۴۸ء میں غصب کردہ زمینوں میں ۹۷ فی صد اراضی کو ہتھیالیا، جن میں ملک بدر کردیے جانے والے فلسطینیوں کی جایدادو املاک اور اسلامی اوقاف کی املاک کے ساتھ وہاں رہ رہے اکثر عربوں کی جایداد بھی شامل تھی۔ جب کہ ۱۹۶۷ء میں قبضہ کردہ زمینوں میں سے مغربی کنارے کی ۶۰ فی صد زمینوں کو اسرائیل نے ضبط کرکے وہاں ۱۹۲ کالونیاں بناڈالیں، اسی طرح غزہ پٹی کی ۳۰ فی صد اراضی کو ہتھیا کر اس پر ۱۴ کالونیاں تعمیر کرلیں۔ صہیونی ریاست نے جہاں خانماں برباد پناہ گزین فلسطینیوں پر، فلسطین واپسی کا دروازہ یکسر بند رکھا، وہیں دنیا کے کونے کونے سے یہودیوں کو نہ صرف فلسطین میں آبسنے کی ترغیب دی؛ بل کہ ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ چناں چہ ۱۹۴۹ء اور ۲۰۰۰ء کے عرصے میں ۲۸ لاکھ یہودیوں نے فلسطین کو مہاجرت کی، جس سے ریاست اسرائیل میں یہودیوں کی آبادی تقریباً ۵۰ لاکھ ہوگئی۔

القدس شہر میں یہود کی اکثریت:

صہیونیوں نے شہر قدس کی یہودی کاری پر پورا زور صرف کیا، چناں چہ انھوں نے اس کے ۸۶ فی صد حصے کو ہتھیا کر اس کو یہودی مہاجرین سے پاٹ دیا۔ ۲۰۰۰ء کی مردم شماری کے مطابق، شہر قدس میں صرف ۲ لاکھ فلسطینی ہیں، جب کہ یہودیوں کی تعداد ۴ لاکھ ۵۰ ہزار ہے۔ مسجد اقصیٰ کے علاقے میں یعنی مشرقی شہر قدس میں تقریباً ۲ لاکھ یہودیوں کو بسا کر، اس کو یہودی کالونیوں سے گھیر دیا ہے، اس طرح یہ خطہ اسلامی عربی دائرے سے بالکلیہ الگ تھلگ ہوگیا ہے۔ یہودیوں نے شہر قدس کو صہیونی ریاست کا دائمی دارالحکومت اعلان کردیا ہے۔
صہیونی یہودیوں کی مسجد اقصیٰ پر قبضہ کرنے کی بھی کوشش رہی، چناں چہ دیوار بُرّاق کے نام سے موسوم مسجد اقصیٰ کی مغربی دیوار کو انھوں نے اپنے قبضے میں کرلیا ہے، اس کے متصل ''مغاربہ'' محلے کو مٹا کر اس کی اراضی کو ضبط کرکے، اب تک وہاں پر مسجد اقصیٰ کے نیچے کھدائی کے دس مرحلے، انھوں نے مکمل کرلیے ہیں۔ چار ایسی سرنگیں زیر مسجد اقصیٰ کھود ڈالی ہیں، جن کی وجہ سے کسی بھی لمحہ مسجد کے منہدم ہوجانے کا خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔ ۲۵ یہودی تنظیمیں مسجد اقصیٰ کو مسمار کرکے، اس کی جگہ پر یہودی معبد تعمیر کرنے کے لیے، سرگرم عمل ہیں۔ ۱۹۶۷ء سے ۱۹۹۸ء کے عرصے میں مسجد اقصیٰ کو نقصان پہنچانے والی ۱۱۲ سے زیادہ کارروائیاں صہیونیوں نے انجام دی ہیں، جن میں سے ۲۷ کارروائیاں ۱۹۹۳ء کے معاہدۂ اوسلو کے زیر عمل لائی گئی ہیں۔ مشہور ترین ظالمانہ کارروائی جو مسجد اقصیٰ کے خلاف یہودیوں نے انجام دی، وہ ۲۱/ اگست ۱۹۶۹ء کی کارروائی تھی۔

فلسطینی پناہ گزینوں کے ساتھ ظلم وزیادتی:

فلسطینی پناہ گزینوں کے ساتھ ظلم وزیادتی:

فلسطینی پناہ گزینوں کو بیرونِ فلسطین کسی اور ملک یا ملکوں میں بسانے کے حوالے سے، اب تک کے ۲۴۳ منصوبوں کو مسترد کرتے ہوئے، انھوں نے اپنے وطن واپس آکر دوبارہ بود و باش اختیار کرنے کے، اپنے جائز حق پر جمے رہنے کے پختہ اور غیر متزلزل عزم کا مسلسل اظہار کیا ہے۔ لائق ذکر ہے کہ اقوام متحدہ نے ۱۱۰ سے زائد قراردادیں، فلسطینیوں کی اپنے وطن کو واپسی کے حق کے تعلق پاس کی ہیں؛ لیکن صہیونیوں نے ان میں سے ہر ایک کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا ہے؛ کیوں کہ بڑے ممالک نے اس سلسلے میں کوئی سنجیدگی دکھائی نہ عالمی برادری نے صہیونی ریاست کو اس حوالے سے مجبور کیا کہ اس کو انھیں ماننے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہو۔

تقریباً ۵۰ لاکھ فلسطینی پناہ گزینی، کس مپرسی اور فقر و فاقے کی زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ تعداد ان ۱۰ لاکھ باشندگانِ مغربی کنارہ اور غزہ پٹی کے علاوہ ہے، جنھیں اپنے گھروں کو، اسرائیل کی طرف سے لوٹنے کی اجازت نہیں۔ یاد رہے کہ فلسطینی پناہ گزینوں کی اپنے گھروں کو واپسی بیسویں صدی اور اب اکیسویں صدی کا سب سے دیرینہ، دراز اور تکلیف دہ انسانی مسئلہ ہے، جس سے انسانی برادری بڑے بڑے خوش نما دعووں کے باوجود، چپ سادھے اور آنکھیں موندے بیٹھی ہوئی ہے۔

۱۹۴۹ء سے بیسویں صدی کی ساتویں دہائی تک اقوام متحدہ، مسئلہ فلسطین کو، پناہ گزینوں کا مسئلہ باور کرتی رہی ہے اور اسی حیثیت سے اس سے نمٹتی رہی ہے۔ ۱۹۷۴ء سے اس نے اپنی جنرل اسمبلی سے بھاری اکثریت سے قراردادیں پاس کیں، جن میں فلسطینیوں کو خود مختاری کا حق دیا گیا ہے اور غصب کردہ حقوق کی بازیابی کے لیے مسلح جدوجہد کے قانونی جواز کو تسلیم کرتے ہوئے، صہیونیت کو نسلی امتیاز کی صورتوں میں سے ایک صورت تسلیم کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی فلسطینیوں کی اپنے وطن کو واپسی کے حق کو، ناقابل تبدیل حق مانا گیا ہے؛ لیکن ریاست ہائے متحدہ امریکہ ان قراردادوں کی معنویت کو ختم کردینے، ان سے اسرائیل کی طرف سے پیہم چشم پوشی کیے رہنے اور ان میں سے ہر ایک کو ویٹو پاور کے ذریعے برپا نہ ہونے دینے کی، راہ پر چلتا ہے۔ دوسری طرف ریاست ہائے متحدہ اور عالمی برادری، نہ صرف صہیونی ریاست کے قیام؛ بل کہ اس کے استحکام کے لیے، ہر طرح کا قانونی جتن کرتی رہتی ہے جس سے عالمی برادری کے دوہرے پن اور امریکہ کے نفاق اور دوغلے پن کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے۔

فلسطینی مسلمانوں کی مزاحمت کو کچلنے کا مرحلہ وار آغاز:

۱۹۶۷ء تا ۱۹۷۰ء کا عرصہ رضاکارانہ عمل اور فلسطینی مزاحمت کے تعلق سے سنہرا دور تھا؛ لیکن ۱۹۷۰ء سے فلسطینی مزاحمت کو اردن کی سرزمین استعمال کرنے کی اجازت نہیں رہی۔ اس کے بعد صرف لبنان کے ذریعے اپنی کارروائیاں انجام دینے کی راہ اُس کے لیے کھلی رہ گئی تھی؛ لیکن ۱۹۷۵ تا ۱۹۹۰ء کی مدت میں لبنان کی خانہ جنگی کے دوران، فلسطینی مزاحمت کو وہاں بھی لوہے کے چنے چبانے پڑے تھے؛ کیوں کہ اس کو بار بار نشانہ بنایا گیا اور اس کی بیخ کنی کی پیہم کوششیں کی گئیں۔

۱۹۷۸ء میں صہیونی ریاست کی طرف سے جنوبی لبنان پر حملے اور قبضے، پھر ۱۹۸۲ء میں اس کی طرف سے کارندہ سیکورٹی پٹی کے قیام کی وجہ سے، مزاحمت کا اسٹرکچر بری طرح تباہ ہوگیا، بالآخر تنظیم آزادی فلسطین کو لبنان سے اپنے سپاہیوں کو نکال لینا پڑا۔ اس طرح پہلی بار یہ ہوا کہ فلسطینی مزاحمت کے لیے ساری صہیونی سرحدیں مسدود ہوگئیں۔

فلسطین کی تحریکِ مزاحمت کو سب سے زیادہ نقصان عرب ممالک نے پہنچایا:

بالعموم فلسطینی تحریک انقلاب کو اپنے عرب برادر ملکوں کی طرف سے بڑی مخالفت کا سامنا رہا، جس کی وجہ سے اس کی توانائیوں کا ضیاع ہوتا رہا اور عربی حکومتوں کے ساتھ خون ریز تصادم کی وجہ سے، جانی خسارے سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ ان عربی حکومتوں نے تحریکِ انقلاب کو سِدھانے، اپنے کنٹرول میں لینے، بہ جبر اس کا ترجمان بننے اور اس کے کندھے پر بندوق رکھ کر اس کو چلانے کی کوشش کی۔

اکتوبر ۱۹۷۳ء کی جنگ کے بعد، جس میں مصر اور سیریا کے حق میں بہت سی معنوی کام یابیاں بہ روئے کار آئیں اور ۱۹۷۴ء میں تنظیم آزادی فلسطین کو فلسطینیوں کی واحد قانونی نمایندہ تنظیم مان لیے جانے کے بعد، فلسطین کے تعلق سے عربوں کا احساسِ ذمے داری کم زور پڑنے لگا۔ ستمبر ۱۹۷۸ء میں مصر کی طرف صہیونی وجود کے ساتھ تنہا "کیمپ ڈیوڈ معاہدے" پر دستخط کردینے کے بعد، عربی صہیونی کش مکش سے سب سے بڑی عربی طاقت دست کش ہوگئی۔

۱۹۸۰ تا ۱۹۸۸ء جاری رہنے والی عراق ایران جنگ کی وجہ سے تیل کی قیمتوں میں زبردست گراوٹ آگئی، جس کے نتیجے میں فلسطینی تحریک انقلاب کی مالی مدد بہت محدود ہو کر رہ گئی۔ ۱۹۹۰ء میں کویت پر عراق کے حملے کی وجہ سے جو خلیجی جنگ پر منتج ہوئی اور جس کی وجہ سے عربی اسلامی صفوں میں ایسا انتشار رونما ہوا، جس کی نظیر ماضی میں نہیں ملتی، نیز سوویت یونین کے زوال اور مشرقی بلاد کی شکست کے بعد، ایک قطبی دنیا میں جو تباہ کن حالات و واقعات رونما ہونے کی وجہ سے فلسطینی مزاحمت کی رہی سہی طاقت بھی بکھر گئی اور تنظیم آزادی فلسطین صلح و امن اور معاہدوں کی راہ پر چل پڑی۔ بالآخر اس کی سرگرمیاں "سیاسی امکان" کے دائرے میں سمٹ کر رہ گئیں۔ یہ اس لیے بھی ہوا کہ تنظیم کی قیادت میں اپنی بقا اور فلسطینیوں کی نمایندگی زمام اپنے ہاتھ میں لیے رہنے کے لیے، اپنے بعض ٹھوس اصولوں سے دست برداری کا رجحان پیدا ہوگیا تھا۔

صہیونی ریاست کے ساتھ امن پسندانہ سمجھوتہ:

تنظیم آزادی فلسطین کی کم زوری میں اضافے کے ساتھ ساتھ صہیونی ریاست کے ساتھ امن پسندانہ صلح صفائی کا رجحان رکھنے والے دھڑے کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، یہاں تک کہ نومبر ۱۹۸۸ء میں تنظیم نے، اقوام متحدہ کی قرارداد (۱۸۱) کو تسلیم کرلیا، جس میں فلسطین کو عربوں اور یہودیوں کے درمیان تقسیم کردیے جانے کی بات کہی گئی ہے۔ نیز تنظیم نے اقوام متحدہ کی قرارداد (۲۴۲) جاری کردہ نومبر ۱۹۶۷ء کو مان لیا، جس میں قضیہ فلسطین کو محض پناہ گزینوں کا قضیہ باور کرایا گیا ہے اور اس قضیے کو امن پسندانہ راہوں سے حل کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

اکتوبر ۱۹۹۱ء میں تنظیم اور عرب ممالک نے صیہونی ریاست کے ساتھ "مڈریڈ" میں براہ راست صلح وامن کے مذاکرات تک کا سلسلہ شروع کیا۔ تقریباً دو سالہ مذاکرات کے نتیجے میں تنظیم، ریاست اسرائیل کے ساتھ، کسی معاہدے کے نتیجے تک نہیں پہنچ سکی۔ ہاں دسمبر ۱۹۹۲ء میں رازدارانہ مذاکراتی چینل کے ذریعے، بند کچھ کھلتی نظر آئی، جس کے نتیجے میں "اوسلو" معاہدہ" یا "پہلے غزہ۔اریحا معاہدہ" عمل میں آیا جو ناروے کے شہر "اوسلو" میں بروئے کار لایا گیا، جس تنظیم نے سرکاری طور پر صیہونی ریاست کے ساتھ واشنگٹن میں ۱۳/ستمبر ۱۹۹۳ء میں دستخط کیے۔

غزہ۔اریحا" معاہدے کی رو سے تنظیم نے اسرائیل کے وجود کے حق کو تسلیم کرلیا، یہی نہیں بل کہ ارض فلسطین کے ۷۷ فیصد حصے پر اس کے قبضے اور ملکیت کے جواز کو بھی سندِ تسلیم عطا کردی۔ ساتھ ہی تنظیم نے مسلح مزاحمت اور انتفاضے سے دست برداری کا اپنے کو پابند عہد کرلیا اور سارے فلسطین کی آزادی کے سارے دعووں سے دست کش ہوجانے اور اپنے قومی چارٹر سے، صیہونی ریاست کی تباہی اور اس کو مٹاڈالنے کی بات کی مکمل منسوخی کا اعلان کرتے ہوئے سارے مسائل کو پرامن راہوں سے حل کرنے کا پابند رہنے کی یقین دہانی کرادی۔

تنظیم کو اس کے بدلے میں اسرائیل سے جو کچھ ملا وہ یہ کہ اس کو فلسطینیوں کا واحد قانونی نمایندہ مان لیا گیا اور غزہ پٹی اور مغربی کنارے کے کچھ ٹکڑوں پر، اس کو نام نہاد خود مختار حکومت قائم کرنے کا اختیار دیا گیا اور یہ کہ دیگر بنیادی مسائل آیندہ ۵ سالوں کے دوران حل کرلیے جائیں گے۔

غزہ۔اریحا معاہدے کے تعلق سے اہم ریمارکس اور اشارے:

فلسطینیوں کی طرف سے اس معاہدے کو کتنا تسلیم کیا گیا تھا، اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اس کو صرف تنظیم کی قیادت کرنے والی تحریک "فتح" اور دو چھوٹے فلسطینی دھڑوں نے مانا تھا، جن کا عوام میں کوئی وزن نہ تھا یعنی "فدا" محاذ اور "محاذ قومی جدوجہد" خود "فتح" کے اندر بہت سے دھڑوں نے اس معاہدے اور اس کی اساس پر ہونے والے دیگر معاہدوں کی شدید مخالفت کی۔ جیسے "فاروق قدومی" "ہانی حسن" "خالد حسن" اور "محمود غنیم" وغیرہم نے۔

فلسطینیوں کی اکثر تحریکیں اور مزاحمتی گروہ، اس کے بالکل مخالف تھے اور ہیں، جن میں تحریک "حماس" سرفہرست ہے۔ دیگر باوزن طاقتوں اور تحریکوں نے بھی اس کو بالکل مسترد کردیا تھا، جیسے "عوامی محاذ" "جہادِ اسلامی" اور دیگر سات تنظیمیں۔

معاہدے کا یہ منصوبہ ہی درحقیقت از اول تا آخر صیہونی ہے، جس کا مقصد گھنیری فلسطینی آبادی والے علاقوں کے بوجھ سے گلو خلاصی حاصل کرنا تھا، جہاں بہت سے اقتصادی اور سیکورٹی کے مسائل ہیں۔ اسرائیل عرصے سے غزہ پٹی سے پلو جھاڑنا چاہتا تھا، کیوں کہ یہ دنیا میں زبردست گھنیری آبادی والے خطوں میں سے ایک ہے، بل کہ کئی بار اس نے یہ علاقہ مصر کے حوالے کرنے کی پیش کش کی لیکن مصر اس کے لیے کسی طرح تیار نہ ہوا۔

اس معاہدے کے لیے، تنظیم نے عوام سے کوئی رائے نہیں لی، بل کہ از خود یہ معاہدہ تنِ تنہا کرلیا۔

اس معاہدے کی رو سے عملی طور پر فلسطینیوں کو، صہیونی ریاست کے زیرِ نگرانی اس کے بہ راہِ راست کنٹرول کے تحت، محدود اختیارات والی ''خود مختار حکومت'' کے قیام کا حق دیا گیا ہے۔ جاے حکومت پر بھی فلسطینیوں کو اقتدارِ اعلیٰ اور مکمل خود مختاری حاصل نہیں ہوگی، ان کی حکومت قانون سازی میں بھی صہیونی ریاست سے، رابطے اور ہم آہنگی کی پابند ہوگی۔

اس معاہدے میں بنیادی مسائل کے تئیں التوا کی پالیسی اپنائی گئی ہے۔ فلسطینیوں کی آزادی پر منتج ہونے والی کسی صورتِ حال کا وعدہ نہیں کیا گیا ہے اور نہ مغربی کنارے اور غزہ پٹی سے اسرائیل کے انخلا کی کوئی بات کہی گئی ہے۔ یہودی بستیوں کو ختم کرنے یا مشرقی قدس کو فلسطینیوں کے حوالے کرنے کے تعلق سے بھی مکمل خاموشی برتی گئی ہے۔

یاد رہے کہ مشرقی قدس میں ہی مسجدِ اقصیٰ واقع ہے۔ فلسطینیوں کی اپنے وطن کو واپسی کی بات بھی لپیٹ دی گئی ہے۔ مذاکرات کے سال ہا سال بعد بھی اب تک کوئی مرکزی مسئلہ حل نہیں ہوا، نہ اس کی دور دور تک کوئی امید ہے، بل کہ صہیونی ریاست کی طرف سے مقبوضہ اراضی کو یہودیانے کے تعلق سے ریس جاری ہے، اس کو کسی معاہدے سے عالمی فیصلے اور عالمی برادری کی کسی مانگ کا کوئی پاس نہ تھا نہ آیندہ ہوگا۔ فلسطینی مقتدرہ کو مغربی کنارے کی اراضی میں سے انتظامی طور پر صرف ۴۲ فیصد پر کنٹرول دیا گیا ہے۔

صہیونی ریاست کے خلاف کسی طرح کی فلسطینی جدوجہد، مسلح کارروائی اور انتفاضے کے تحت کیے جانے والے کسی بھی عمل کو کچل دینا، فلسطینی مقتدرہ کی مجبوری ہے، بل کہ اپنے ''خلوص'' اور نیک نیتی کو ثابت کرنے کے لیے، فلسطینی تنظیموں کے مجاہدین اور انتفاضہ کاروں کو گرفتار کرنا، جیل میں ڈالنا، سزا دینا، یا اسرائیل کے حوالے کردینا، فلسطینی مقتدرہ کی ذمہ داری ہے، تاکہ پہ اندازہ ہوسکے کہ اس کو امن اور صلح سے دل چسپی ہے، اس نے ۹/سیکورٹی ادارے قائم کیے ہیں، جن کے ذریعے فلسطینی مسلمانوں کی سانسیں گنی جارہی ہیں، اور ان کی مصیبتوں سے بوجھل زندگی کو اور بوجھل بنایا جارہا ہے۔ لائقِ عبرت ہے کہ فلسطینی مقتدرہ اقتصادی، سیاسی اور اجتماعی میدانوں میں یکسر ناکام رہی ہے، حالاں کہ انھیں میدانوں میں اصلاً اس کو اپنی کارکردگی ثابت کرنی چاہیے تھی۔ اس کے سارے ادارے بدعنوانیوں کی مثال بن گئے ہیں۔

اس معاہدے کی وجہ سے، دیگر اسلامی اور عربی ملکوں کے لیے صہیونی ریاست کے ساتھ معاہدوں اور تعلقات کے قیام کے دروازے چوپٹ کھل گئے ہیں، اور سارے عربی علاقوں میں اس کی درآمد، اقتصادی رسوخ، بل کہ معاشی اقتدار اور قومی اسلامی علاقوں پر ضرب لگانے کی راہ وا ہوگئی ہے۔

اس معاہدے کی وجہ سے تنظیمِ آزادیِ فلسطین، اپنی ذات، اپنے اہداف اور اپنے چارٹر کو یکسر مسترد کرتے ہوئے مسلح جدوجہد سے کنارہ کشی کی پابند ہوگئی ہے، جس کو اب دہشت گردی کا نام دے دیا گیا ہے۔ اسرائیل میں اسی دن سے جشن کا سماں ہے کہ تنظیم نے جو فلسطینیوں کی واحد نمایندہ جماعت تھی، فلسطینیوں کی اراضی غصب کرتے رہنے، فلسطینیوں کو دربدر کردینے اور ان کے حقوق کو سلب کرلینے کی واضح طور پر منظوری دے دی ہے۔

صہیونی ریاست کے ساتھ، امن معاہدے کے تعلق سے، قابلِ اعتماد تمام علمائے عرب و مسلمین نے عدم جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ غصب کردہ فلسطینی اراضی کی بازیابی اور اسلام کے جھنڈے تلے ان کی واپسی کے لیے مقدس جہاد کو لازمی قرار دیا ہے۔ انھوں نے عربوں کی اسرائیل کے ساتھ کش مکش کو حق و باطل کا تصادم مانا ہے، جو نسل در نسل مسلمانوں کو وراثت میں ملتا رہےگا، تا آں کہ اللہ جل شانہ اپنی قدرتِ کاملہ سے مسلمانوں کو فتح و غلبہ سے ہم کنار کرے گا۔

مسلمانوں کے کسی نسل کو، جو ضعف اور توانائی اور بے سروسامانی سے دوچار ہو، آیندہ مسلمان نسلوں کو جہاد کے مقدس فریضے سے محروم کردینے اور اس کی راہ روک دینے کا حق حاصل نہیں۔ پیشِ نظر رہے کہ قضیہ فلسطین روئے زمین کے سارے مسلمانوں کا قضیہ ہے، جو اس سے کسی طرح بھی دست بردار ہونے کو تیار نہیں، خواہ اس کے حل میں طویل زمانے لگ جائیں۔ یعنی یہ قضیہ صرف فلسطینیوں کا بھی قضیہ نہیں چہ جائے کہ تنظیم آزادیِ فلسطین اس کو اپنا ذاتی مسئلہ تصور کرلے اور اس کے جو جی میں آئے کرے۔

انتفاضہ اقصیٰ اولیٰ:

۱۹۸۷ء۔۱۹۸۸ء انتفاضہ اولیٰ مبارکہ کے نتیجے میں زبردست اسلامی بیداری کی ایک لہر پیدا ہوئی، جس نے فلسطینی مزاحمت میں ایک بنیادی عنصر کی حیثیت اختیار کرلی، خصوصاً ''اسلامی تحریک مزاحمت'' (حماس) کے ذریعے یہ بیداری ہر ایک اسلام پسند فلسطینی کے دل میں ایمان و یقین کی ایسی چنگاری بن گئی جس نے تذبذب، تردد اور عدمِ یقین کے سارے اثاثے کو خاکستر کردیا۔ انتفاضے کی وجہ سے باہمی ہمدردی اور قضیہ فلسطین کے تئیں نہ صرف اسلامی و عربی صفوں میں، بل کہ عالمی برادری کی صف میں بھی از سرِ نو دل چسپی پیدا ہوئی، لیکن افسوس کے ساتھ یہ کہنا اور لکھنا پڑتا ہے کہ حالات کی ستم ظریفی فلسطینی و عربی قیادتوں کی ذہنیت نے انتفاضے کی سلگائی ہوئی آنچ کو وسعت پذیری اور آزادیِ فلسطین کے لیے مطلوبہ حد تک بے کراں ہوکر اپنی تاثیر دکھانے کا موقع نہ دیا، بل کہ غصب کردہ صہیونی ریاست کے ساتھ امن معاہدے اور بے معنی تصفیے کے سمت میں سرعت کے ساتھ سیاسی طور پر فائدہ اٹھانے کے لیے، اس کو منفی انداز میں استعمال کیا۔

ستمبر ۲۰۰۰ء میں شروع ہونے والے آخری انتفاضہ اقصیٰ نے، جو ہنوز جاری ہے، پوری طرح یہ ثابت کردیا ہے کہ فلسطینی اپنی خاک کے حوالے سے، اپنے حق سے ذرہ برابر بھی دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں۔

اس انتفاضے کے نتیجے میں مسلم عوام کی فلسطینیوں کے ساتھ بے پناہ ہمدردی اور برادرانہ وانسانی جذبات میں ہم آہنگی کے مظاہرے دیکھنے کو ملے۔ اس کی وجہ سے قضیہ فلسطین کی اسلامی شناخت ایک بار اور پوری طرح اجاگر ہوئی ہے۔ دوسری طرف نہ صرف صہیونی کی بربریت اور صہیونی امن پسندی کے کھوکھلے دعووں کی قلعی کھل گئی ہے، بل کہ تصفیے کے منصوبے کو زبردست طمانچہ رسید ہوا ہے، جو امت مسلمہ کے ناقابل تبدیل اصولوں اور ناقابل دست برداری حقوق کی قیمت پر بروے کار لایا جارہا ہے۔

قضیہ فلسطین ایک انتہائی حساس مسئلہ:

قضیہ فلسطین، زبردست انسانی حیثیتوں کا حامل قضیہ ہے، کیوں کہ اس کی حیثیت انسانی حقوق کے نام نہاد دعوے داروں کے روبہ رو مظلوم کی فریاد ہے۔ نیز اس سے عالمی برادری کی دوہرے پیمانوں اور جدید عالمی نظام کی بے طرح خرابیوں کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اس سے ترقی علم وہنر، ٹیکنالوجی برتری اور انسانی حقوق کی پاس داری کے بے معنی دعووں پر بے تحاشا فخر کنندہ تہذیب کے گھناؤنے نفاق اور دوہرے پن کی بے ہودہ شرم گاہیں بے پردہ ہوجاتی ہیں، جس کو ۵۰ لاکھ پناہ گزینوں کو کھلے آسمان کے نیچے فرش زمین پر اپنے گھروں سے زبردستی نکال کرڈال دیا جانا پسند ہو اور ۴۵۰۰ سو سال سے اپنے وطن کو آباد رکھنے والی قوم کو وہاں سے بہ زور بازو بھگا کر دنیا کے کونے کونے سے فرسودہ بے بنیاد دعووں کے تحت (جو نہ تو تاریخ کی منطق کے مطابق ہیں نہ جدید تمدنی اقدار سے ہم آہنگ ہیں، نہ عالمی قوانین سے مطابقت رکھتے ہیں) ہر رنگ ونسل کے یہودیوں کا آبسنا نہ صرف گوارا ہو اور جس کو یہ بھی گوارا ہو کہ ارض مقدس کو بے گناہوں کے خون سے لالہ زار کیا جاتا رہے، جس کو محبت وامن کی زمین ہونا چاہیے۔ صہیونی تحریک اور اس کا فلسطین پر قبضہ، درحقیقت اس باقی ماندہ مغربی روایتی استعمار کا نمونہ ہے، جس کی بساط ساری دنیا سے لپٹ چکی ہے اور جلد یا بدیر، ان شاء اللہ ارضِ فلسطین سے لپٹ جائے گی۔

اسرائیل کی تباہی میں انسانیت کی سلامتی مضمر ہے:

عالم اسلام کے قلب فلسطین میں صہیونی ریاست کا وجود اور وسیع تر تباہی کے ہتھیاروں کا اس کے ذریعہ ذخیرہ کیا جانا، جن میں دوسو ایٹمی بم شامل ہیں اور اس کے اندر اس بات کی صلاحیت کا پایا جانا کہ تقریباً دس لاکھ کی نفری فوج کو ۷۲ گھنٹے میں الرٹ کرسکتی ہے، عالمی امن کے دھماکے کے لیے ہمہ وقت یقینی خطرہ ہے، جس سے تیسری عالمی جنگ کا بھیانک خطرہ ہر جگہ موجود ہے، اس لیے کہ بالیقین کسی نہ کسی آیندہ وقت میں مسلمانوں کے پاس بھی وسیع تر تباہی کے ہتھیار اور طاقت کے ہمہ گیر اسباب ہوں گے، اس لیے اللہ تعالیٰ دنوں کو لوگوں کے درمیان تبدیل کرتا رہتا ہے اور حالات کی یکسانیت باقی نہیں رہتی اور یہ بھی یقینی ہے کہ مسلمان فلسطین میں اپنے حق سے کسی بھی حال میں دست بردار نہ ہوں گے اور اس کے قلب کسی ایسی اجنبی ریاست کو ہرگز قبول نہ کریں گے جو اُن کی کمزوری کا باعث بن کر ان کے اتحاد کو پارہ پارہ کرتی رہے۔

وہ اس کے ازالے کی اسی طرح کوشش کرتے رہیں گے، جس طرح انھوں نے اس سے قبل دوسری طاقتوں کے ازالے کی کوشش کی اور بالآخر انھیں کھدیڑ دیا یہ جلد ہی وقت آیا چاہتا ہے جب بڑی ظالم طاقتوں کو یہ معلوم ہوجائے گا کہ اس ناجائز ریاست کا بیج بو کر انھوں نے کتنا بڑا ظلم کیا تھا، جس کی وجہ سے ساری انسانیت موت اور تباہی سے ہم کنار ہونے کو ہے۔ اس خطرناک گھڑی کی آمد سے قبل یہ ریاست ٹوٹ کر بکھر جائے، تو ساری انسانیت کے لیے بڑی خوش آیند بات ہوگی۔(۱)

انتفاضۂ ثانیہ کا آغاز:

جمعرات ۲۸/ستمبر ۲۰۰۲ء (مطابق ۲۷ جمادی الاخریٰ ۱۴۲۱ھ) سے فلسطینی زمین پر مسجد اقصی کے اندر سے انتفاضہ ثانی (دوسرا انتفاضہ) شروع ہوا۔ اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ صہیونیوں کی لیکوڈ پارٹی کا زعیم بدباطن ایریل شیرون، تین ہزار اسرائیلی پولیس کی حفاظت میں، مسجدِ اقصیٰ میں زبردستی گھس آیا، اُس کے ساتھ بہت سے صہیونی انتہاپسند اور دہشت گرد بھی تھے۔ فلسطینی نوجوانوں نے کھلے سینوں اور ننگے جسموں سے اسرائیلی پولیس والوں کی گولیوں کا مقابلہ کیا۔ متعدد جوان شہید ہوگئے اور بہت سے زخمی۔ اس کے بعد سارے ارضِ فلسطین، غزہ کی پٹی اور رملہ کے علاقوں میں مزاحمت کی ایسی آگ بھڑک اٹھی کہ صہیونیوں کے بجھائے نہ بجھی۔ اسرائیلی فوجوں نے زبردست تباہی کے نت نئے امریکی ہتھیاروں کے ذریعے فلسطینیوں کا قتل عام کیا، ہزاروں کو زخمی اور اپاہج بنادیا، لاتعداد فلسطینیوں کے گھر ڈھادیے، سیکڑوں کو گرفتار کرکے اپنے بدترین عقوبت خانے میں ڈال دیا، سیکڑوں بچوں اور بوڑھوں کو تہ تیغ کردیا؛ لیکن مبارک زمین کے سعادت نصیب جوانوں نے سپر انداز ہونے کے کسی رویے کو لبیک نہیں کہا۔ فلسطینیوں کے ایک دھڑے کو لالچ، دنیاوی مفادات اور مادی وسائل کی چکاچوند سے خیرہ کرکے خود فلسطینی بچوں، بوڑھوں کے خون کا سودا کرنے اور اُن کی بے لوث قربانیوں کو بے معنی بنادینے کی کوشش کی گئی؛ لیکن صہیونی اور اُن کے سرپرست امریکی اس چال میں کامیاب نہ ہوسکے۔

انتفاضۂ ثانیہ کے ہولناک اثرات:

دوسری تحریکِ انتفاضہ کی ابتدا سے اب تک کے وہ اعداد و شمار بھی، جو خود امریکن ریسرچ سینٹر سے شائع ہوئے ہیں، انسانی برادری کو اگر وہ انسانیت سے عاری نہ ہوئی تو ان کو چونکا دینے کے لیے کافی ہیں، جو کچھ اس طرح ہیں:

۱- ۱۲۱/یہودی بچوں کے بالمقابل ۷۲۲/فلسطینی بچے شہید ہوئے۔

۲- ۱۰۸۴/یہودیوں کے بالمقابل ۳۸۷۰/فلسطینی مرد و عورت شہید ہوئے۔

۳- ۴۳۳۷/یہودیوں کے بالمقابل ۲۹۷۶۸/فلسطینی زخمی ہوئے۔

---

(۱) ڈاکٹر محسن محمد سلیمان صالح: "فلسطین بلادنا الحبیبة" مؤسسة الفلاح، قاہرہ مصر ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۱ء

۴۔ امریکہ نام نہاد فلسطینی مقتدرہ کو (جو دراصل امریکہ اور اسرائیل کی کارندہ یا اُس کے مفادات اور چال بازی کی اسیر ہے) دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے اور اپنی جھینپ مٹانے کے لیے یومیہ ۲۳۳۲۹۰ ڈالر دیتا رہا ہے، جب کہ یہودیوں کو یومیہ ۱۵۱۳۹۱۷۱ ڈالر دے رہا ہے۔

۵۔ دوسرے انتفاضے کے بعد سے ایک بھی یہودی جیل میں نہیں، جب کہ ۹۴۹۲ فلسطینی اسرائیل کی جیل عقوبت خانے میں طرح طرح کی سزائیں جھیل رہے ہیں۔

۶۔ انتفاضے کی ابتدا سے اب تک ایک بھی اسرائیلی کا گھر منہدم نہیں ہوا لیکن فلسطینیوں کے ۴۷۱۰ مکانات مکمل طور پر زمین بوس کر دیے گئے۔

۷۔ ۲۰۰۳ء تک فلسطینیوں کے لیے ایک بھی نیا مکان تعمیر نہیں ہوا؛ لیکن مارچ ۲۰۰۱ء جولائی ۲۰۰۳ء تک ۶۵ اسرائیلی آبادیاں بسائی گئیں۔

یاد رہے کہ یہ اعداد و شمار امریکی ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ فلسطینیوں کی تباہی اِس سے کئی گنا زیادہ ہوئی ہے۔

انتفاضۂ ثانیہ اور فلسطینیوں کا جانی و مالی نقصان:

آزاد ذرائع کے مطابق ستمبر ۲۰۰۰ء میں انتفاضے کے بعد سے اب ستمبر ۲۰۰۷ء تک شہید ہو جانے والے صرف فلسطینی بچوں کی تعداد کم از کم ۲۸۰۰ ہے، جن کی عمریں عموماً ۱۵-۱۶ سال سے کم تھیں، جب کہ زخمی بچوں کی تعداد سیکڑوں ہے۔

مقبوضہ علاقوں میں یہودی افواج کے ہاتھ شہید ہونے والے فلسطینیوں کی تعداد ۳۵۰۰ مسلح جدوجہد میں شہید ہونے والوں کی تعداد ۵۹۳ غزہ پٹی میں شہید ہونے والے فلسطینیوں کی تعداد ۹۰۰۰ مغربی کنارے میں شہید ہونے والے فلسطینیوں کی تعداد تقریباً ۱۵۰۰ ہے۔

فلسطینیوں کے مکمل طور پر منہدم کردہ مکانات کی تعمیر تعداد تقریباً ۲۶۰۰ ہے۔

فلسطینیوں کے علاقے میں مقتدرہ کے دائرے میں آنے والے خطوں میں عام راستوں، شاہ راہوں اور عمارتوں کی تباہی کے خسارے کا تخمینہ ۳۰۰ ملین ڈالر سے زیادہ ہے صہیونیوں کی ظالمانہ کارروائیوں کی وجہ سے ۱۴۰۰۰ سے زیادہ کسان متاثر ہوئے۔ صہیونی افواج نے زیرِ تعمیر نسلی دیوار (جو، جون ۲۰۰۲ء مطابق ربیع الاول ۱۴۲۳ھ سے صہیونی ریاست نے فلسطینیوں کو پریشان کرنے اور ان کی مزید زمینوں کو غصب کرنے کے لیے تعمیر شروع کی تھی) کے لیے (۲۰۸۷۰۵۰۰) اسکوائر میٹر زمینیں ہڑپ کر لیں اور (۶۸۷۲۸۰۰۰) اسکوائر میٹر زمینوں سے فلسطینیوں کو مکمل طور پر بے دخل کر دیا۔

۲۰۰۰ء سے ۲۰۰۴ء تک کے عرصے میں ۱۱۴۵۱۴۵ درخت اکھاڑ دیے، جب کہ ۳۵۰ سے زیادہ کنوؤں کو مکمل طور پر تباہ کر دیا، ۱۲۰۰ سے زیادہ حوض اور پانی کے ٹینکس تباہ کر دیے، ۱۰۰ سے زائد زرعی گوداموں کو ڈھا دیا، ۲۵۲۸۵۰۰۰ اسکوائر میٹر کو سیراب کرنے والے سینچائی کے نظاموں کو تباہ کر دیا، دسیوں نرسریوں کو اجاڑ دیا، ۱۵۱ سے زیادہ زرعی بلڈوزروں کو تباہ کر دیا، ۱۵۰۰۰ سے زیادہ بھیڑ بکریوں کو مار دیا۔ جب کہ (۱۵۰۶۵ شہد کے چھتے برباد کر دیے)۔

صنعتی سیکٹر کی سطح پر ۲۰۰۴ء کے اواخر تک ۸۷۰۰۹ ورک شاپوں اور تجارتی مراکز کو یکسر تباہ کر دیا گیا، ۳ لاکھ سے زائد لوگ بے کار ہو گئے۔ بے کار لوگوں کا تناسب ۳،۳۳ فی صد ہو چکا ہے اور غربت کی شرح ۶۸،۶ تک پہنچ چکی ہے۔ (رسالۃ الاخوان) (فلسطین کسی صلاح الدین کے انتظار میں: ص ۶۰ تا ۸۱)

۲۰۰۷ء سے اب تک کے مظالم کی ایک جھلک:

۲۰۰۷ء سے اب تک کے مظالم کی ایک جھلک:

صہیونی حکومت نے ۲۰۰۷ء سے غزہ پٹی کا وحشیانہ محاصرہ کر رکھا ہے، جس کی وجہ سے اہلِ غزہ کو شدید مسائل کا سامنا ہے۔ اس دوران مصری حکومت بھی گزرگاہ رکو بند کر کے عملی طور پر فلسطینیوں کے خلاف صہیونی حکومت کی ظالمانہ پالیسیوں کا ساتھ دیتی آ رہی ہے۔

غزہ پر صہیونی حکومت کے وحشیانہ نتائج میں خاص طور سے مصر کے ہاتھوں گزرگاہ "رفح" کے بند کرنے ؛ نیز غزہ کو مصر سے ملانے والی سرنگوں کی تباہی سے ان مظالم میں شدید شدت آئی ہے ؛ بل کہ روز بروز ان میں شدت آتی ہی جا رہی ہے۔ اس مسئلے پر فلسطینی رائے عامہ اور فلسطینی گروہوں نے شدید احتجاج کیا ہے۔ اس سلسلے میں فلسطین کی وزارت داخلہ نے غزہ کو مصر سے ملانے والی گزرگاہ یعنی گزرگاہ رفح کو فوری کھولے جانے پر تاکید کی ہے تا کہ سیکڑوں بیماروں کی جانیں بچائی جا سکیں۔

فلسطینی وزارت داخلہ کے ترجمان ایاد البزم نے غزہ میں کہا کہ گزرگاہ رفح کا کھولا جانا سیکڑوں فلسطینی بیماروں کی جان بچانے کے لیے ضروری ہے جو کینسر اور دیگر بیماریوں میں مبتلا ہیں۔ ایاد البزم نے کہا کہ گزرگاہ رفح گزشتہ آٹھ مہینوں میں محض پندرہ دن کے لیے کھولی گئی تھی جس سے محصور فلسطینیوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

واضح رہے کہ مصری حکام گزرگاہ رفح کو دائمی طور پر کھولنے سے انکار کرتے ہوئے عملی طور پر صہیونی حکومت کے مجرمانہ محاصرے بالخصوص غزہ کے شہریوں کے خلاف صہیونی جرائم میں شریک ہو چکے ہیں۔ ادھر مصر کے فوجی حکام نے فلسطینی عوام کے لیے کہا: جزیرۂ سینا میں دہشت گردوں کی دراندازی کو روکنے کے لیے سرحد پر خندق کھودی جا رہی ہے، جس سے غزہ اور مصر کے درمیان ہر طرح کی آمد و رفت بند ہو جائے گی۔

واضح رہے کہ مصری حکام نے مختلف مواقع پر غزہ محاصرے کے سلسلے میں صہیونی حکومت کی پالیسیوں کا ساتھ دیا ہے۔ اس سے قبل بھی مصر کے سابق ڈکٹیٹر حسنی مبارک بھی فلسطینیوں ؛ بالخصوص غزہ کے باشندوں کے خلاف صہیونی حکومت کی پالیسیوں کا ساتھ دیتے رہے ہیں۔ حسنی مبارک کی حکومت کے خاتمے کے بعد بھی یہ پالیسیاں عملی طریقے سے کم و بیش جاری رہیں۔ انہیں پالیسیوں کے تناظر میں مصر کی فوج نے خاص طور سے صدر مرسی کی معزولی کے بعد مستقل طور پر گزرگاہ رفح کو بند رکھا ہے اور فلسطینیوں کو اس گزرگاہ سے آنے جانے کی ہرگز اجازت نہیں دی ہے۔

مصری فوج نے اس کے علاوہ وسیع کارروائیاں کرتے ہوئے غزہ اور مصر کی سرحد پر کئی سرنگوں کو تباہ کر دیا۔ ان سرنگوں سے فلسطینی اپنے لیے غذائی اشیا اور ایندھن لے کر آتے تھے۔ مصر میں سابق ڈکٹیٹر حسنی مبارک کی حکومت کے دوران بھی قاہرہ نے واشنگٹن کے تعاون سے غزہ کے ساتھ اپنی سرحد پر فولادی دیوار بنانا شروع کی اور اب عبد الفتاح سیسی کے زمانے میں بھی اس دیوار کی تعمیر کا کام جاری ہے۔ غزہ پٹی کی سرحد پر فولادی دیوار زمین کے اندر تیس میٹر تک بنائی جارہی ہے اور اس کی لمبائی نو سے دس کلو میٹر ہے۔ اس دیوار کا اچھا خاصا حصہ بنایا جاچکا ہے۔ یہ دیوار فولاد کے شیٹوں کی ہے، ہر شیٹ کی لمبائی اٹھارہ میٹر اور ضخامت پچاس سنٹی میٹر ہے۔ مصری حکام نے اس دیوار کی تعمیر شروع کر کے عملی طور سے غزہ کے محاصرے میں مکمل کردار ادا کیا ہے؛ یہاں تک کہ فلسطینیوں کا کہنا ہے کہ غرب اردن میں صہیونی حکومت کی نسل پرستانہ حائل دیوار اور مصر کی فولادی دیوار میں کسی طرح کا فرق نہیں ہے۔ یہ ایک دوسرے کو مکمل کرتی ہیں جو فلسطینیوں کے لیے مزید مشکلات کھڑی کرنے کے لیے تعمیر کی جارہی ہے۔

اسرائیل کی سفاکیت پر عالم اسلام کی مجرمانہ خاموشی:

بس! میں صرف مسلمان عوام کو اور ساری دنیا کے انسانوں کو فلسطین کی طرف لے جانا چاہتا ہوں، جہاں روزانہ بے گناہوں کا قتل عام ہوتا ہے، خواتین کو سرِ عام گولیاں ماری جاتی ہیں، پر امن مسلمانوں کو مسجد اقصیٰ میں نماز ادا کرنے سے روک دیا جاتا ہے، غریب مسلمانوں کا؛ جو اپنے آبا و اجداد کے وقت سے فلسطین میں رہ رہے ہیں اور جن کی کئی نسلیں فلسطین کی سرزمین میں مدفون ہیں، ان کے گھروں کو مسمار کیا جاتا ہے اور ان کو بے گھر و آسرا کھلے آسمان تلے ہجرت کرنے یا خیموں تک محدود کر دیا جاتا ہے اور جو کوئی اپنی مظلومیت پر آواز بلند کرتا ہے تو اس پر دہشت گرد اور انتہا پسند ہونے کا ٹھپہ لگا کر یا تو مار دیا جاتا ہے یا سلاخوں کے پیچھے بھیج دیا جاتا ہے، حتیٰ کہ ان کے معصوم بچوں تک کو گرفتار کر لیا جاتا ہے۔

جی ہاں! فلسطین میں یہ کوئی نئی بات نہیں۔ بین الاقوامی ریڈ کریسنٹ کی رپورٹ کے مطابق صرف اکتوبر کے مہینے میں (Red Crescent) ادارہ اسرائیلی فوجیوں کے حملوں میں چھبیس سو افراد زخمی ہوئے جن کو ربڑ اور اصلی گولیوں سے نشانہ بنایا گیا، ایک اور رپورٹ کے مطابق دو مہینوں میں ایک ہزار بچے گرفتار ہوئے اس کے علاوہ روزانہ فلسطینی شہید ہو رہے ہیں، اسرائیلی بربریت کا یہ عالم ہے کہ ان کی شیلنگ سے ایک آٹھ ماہ کی بچی بھی شہید ہوئی۔ ابھی یہ ظلم کم نہیں ہوئے تھے کہ اسرائیل نے اب ایک اور قانون تیار کیا ہے، جس کی رو سے چودہ سال سے کم عمر کے بچوں کو گرفتار کرنا اور ان کو قید کرنا قانونی قرار دیا ہے، جو کھلے عام انسانی حقوق کی پامالی ہے۔ حال ہی میں فلسطینی کی جانب (Palestinian Prisoners Society) ادارے، فلسطینی پریزنرز سوسائٹی سے ایک رپورٹ شائع ہوئی ہے، جس میں ان کا کہنا ہے کہ اسرائیل کی جیلوں میں ۴۰۰ فلسطینی بچے موجود ہیں جن کی عمر ۱۳ سے ۱۷ سال تک ہے اور ان بچوں کو اسرائیلی فوجیوں نے فلسطین کے مختلف علاقوں سے گرفتار کیا ہے۔

اب ذرا امریکہ کی طرف دیکھیں۔جو اپنے آپ کو دہشت گردوں کے خلاف جنگ میں عالمی چمپین اور انسانی حقوق کا علم بردار سمجھتا ہے۔فلسطین میں اسرائیلی مظالم میں برابر کے شریک ہیں،بش کے زمانہ میں امریکہ اسرائیل کے درمیان ۱۰ رسال کا معاہدہ ہوا تھا،جس میں امریکہ ہر سال ۳ ربلین ڈالر فوجی امداد کی مد میں اسرائیل کو دے گا،جو ۲۰۰۷ء تا ۲۰۱۷ء تک تھا۔ابھی حال ہی میں یہ معاہدہ ختم ہونے سے پہلے اسرائیلی وزیر اعظم کے دورۂ امریکہ کے دوران مزید دس سالہ معاہدہ طے پایا ہے،جس میں امریکہ ہر سال ۳ بلین سے بڑھا کر ۵ بلین ڈالر اسرائیل کو فوجی امداد کی مد میں ادا کرے گا۔جو ۲۰۱۸ء سے ۲۰۲۸ء تک ہوگا۔میری امریکہ سے گزارش ہے کہ امریکہ اسرائیل جیسے دہشت گرد کو مشرقِ وسطیٰ میں رکھ کر ہر سال امریکی عوام کے ٹیکس سے ڈالر بھیجنے کے بجائے اسرائیلیوں کو امریکہ میں ہی بسالے،امریکہ میں ایک اور اسٹیٹ کا اضافہ ہوگا اور اسرائیل وہاں خوش بھی ہوں گے اور کسی دشمن کا خوف بھی نہیں ہوگا۔اور نہ ہی فلسطینی حماس کے حملے ہوں گے،اسرائیلی وہاں خوشی سے رہیں گے امریکہ کی پریشانی بھی کم ہوگی،ادھر فلسطینی اپنے وطن میں خوشی سے رہیں گے؛ بل کہ مشرقِ وسطیٰ کی امن وسلامتی بھی بحال ہوگی؛ کیوں کہ یہ ان کے مفاد میں نہیں ہے۔افسوس ہے ان انسانی حقوق کے علم برداروں پر اور ان مسلم ممالک خصوصاً عرب ممالک پر جنہوں نے پیرس کے سانحہ پر تو آسمان سر پر اٹھالیا،مگر کبھی فلسطین کے شہدا کے لیے ایک منٹ کی خاموشی اختیار نہیں کی اور نہ ہی فیس بک اور بلڈنگوں پر فلسطین کا پرچم لہرایا۔سوائے کچھ ممالک کے،بل کہ حد تو یہ ہے کہ بعض مسلمانوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر اسرائیل فلسطین جنگ ہو تو میں اسرائیل کا ساتھ دوں گا جب مسلمان حکمرانوں کا یہ عالم ہو اور وہ اپنی تمام تر طاقتوں کے باوجود مٹھی بھر دشمن کے سامنے غلام بن کر رہیں گے تو دشمن ہمارے ہی وسائل سے ہمیں قتل کریں گے۔مشرقِ وسطیٰ میں اسرائیل کو یہ جرأت بھی مسلم حکمرانوں کی وجہ سے حاصل ہوئی،جنھوں نے اپنے اقتدار اور مفاد کی خاطر اسلام دشمنوں کو گلے لگایا اور ان کو بسانے اور طاقت ور بنانے میں مدد فراہم کی،افسوس ہے مسلمانوں پر جو ایک چھوٹے سے علاقہ اور قبلہ اول کو دشمنوں کے شر سے نہیں بچاسکا اور اپنوں کے مارے جانے پر خوشی اور کافروں کے مرنے پر غم زدہ ہوتے ہیں،افسوس ہے عرب ملکوں اور حکمرانوں پر،عرب والے اگر صرف عرب ہونے کے ناطے بھی جمع ہوجائیں،تو فلسطین سے اسرائیل کا ناجائز وجود ختم ہوجائے گا،مگر عربوں نے اپنے ضمیر کے ساتھ انسانیت اور دین وایمان کو بھی فروخت کردیا ہے سوائے کچھ لوگوں کے؛ جو دشمن کے سامنے میدانِ عمل میں ڈٹے ہوئے ہیں۔

کس طرح فلسطین پر قبضہ کیا گیا یہ جاننے کے بعد عالمی قانون کے اعتبار سے فلسطین اور القدس پر مسلمانوں کا حق کیسے بنتا ہے اس کو بھی جانتے چلیں۔

یروشلم پر یہود کا حق۔قانونی پہلو:

یروشلم پر یہود کا حق۔قانونی پہلو:

امریکہ نے اسرائیل میں اپنا سفارت خانہ تل ابیب سے یروشلم منتقل کرنے کا فیصلہ تو کرلیا لیکن سوال یہ ہے کہ جب بین الاقوامی قوانین کے تحت یروشلم اسرائیل کا شہر ہے ہی نہیں تو سفارت خانہ وہاں منتقل کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ سوال بہت ہی اہم ہے؛ چناں چہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ جو ممالک اسرائیل کے ناجائز وجود کو بطور ریاست تسلیم کرچکے ہیں وہ بھی اس اقدام کی حمایت نہیں کرپارہے کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ اس اقدام کی کوئی توجیہ پیش نہیں کی جاسکتی۔

اسرائیل کے ناجائز قیام کی بحث کو ایک طرف رکھ دیجیے اور اسی بیانیہ میں معاملے کو دیکھ لیجیے، جس بیانیہ میں اسرائیل کا قیام عمل میں لایا گیا۔ برطانیہ اور اقوام متحدہ کی سرپرستی میں جب اسرائیل کا قیام عمل میں لایا گیا تو یہ بات طے کردی گئی کہ یروشلم کا شہر اسرائیل کا حصہ نہیں ہوگا۔

۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے قرارداد نمبر ۱۸۱ کے تحت یہ قرار دیا کہ یروشلم کی حیثیت "Corpus Separatum" کی ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ شہر اب کسی ایک ریاست کا حصہ نہیں، اس کی الگ اور جداگانہ حیثیت ہے۔ اقوام متحدہ نے کہا چوں کہ اس شہر کی مذہبی حیثیت ایسی ہے کہ یہ تینوں مذاہب کے لیے محترم ہے، اس لیے اس علاقہ میں اسرائیل اور فلسطین نام سے دو ریاستیں تو وجود میں آرہی ہیں؛ لیکن یروشلم کا شہر "Corpus Separatum" ہوگا اور اس کا انتظام اقوام متحدہ چلائے گی۔ یہی بات جنرل اسمبلی نے گیارہ ستمبر ۱۹۴۸ء کی اپنی قرارداد نمبر ۱۹۴ میں کہی اور اس بات کا اعادہ فلسطین پر اقوامِ متحدہ کے کمیشن (UNCCP) نے ۱۹۴۹ء میں سوئزرلینڈ کے شہر لاوزین میں اس کانفرس میں کیا جو ۲۷ اپریل سے ۱۲ ستمبر تک جاری رہی۔

اسرائیل نے ۱۹۴۹ میں مصر، اردن، شام اور لبنان سے معاہدے کیے جنہیں "Armistice Agreement" یعنی صلح کے معاہدے کہا جاتا ہے، ان میں بھی یروشلم کی یہ حیثیت برقرار رکھی گئی۔ چناں چہ ایک انتظام کے تحت مشرقی یروشلم اردن کے پاس چلا گیا۔ یاد رہے کہ مسجدِ اقصیٰ، قبۃ الصخرا، مغربی دیوار اور چرچ آف دی ہولی سیپلکر یعنی کنیسہ القیامہ اسی مشرقی یروشلم میں واقع ہیں۔ ۱۹۶۷ء تک یہ مقامات مسلمانوں کے پاس رہے اور اردن ہی ان کے انتظامی معاملات کو دیکھتا رہا۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ میں اسرائیل نے مشرقی یروشلم پر قبضہ کرلیا، لیکن دنیا نے اس قبضہ کو آج تک تسلیم نہیں کیا۔ اقوامِ متحدہ کے مطابق مشرقی یروشلم "مقبوضہ فلسطین" ہے اور اسے اسرائیل نہیں کہا جاسکتا۔ سلامتی کونسل نے ۲۲ نومبر ۱۹۶۷ کو قرارداد نمبر ۲۴۲ کے ذریعے اسرائیل کے قبضے کو ناجائز قرار دیا اور اسے مشرقی یروشلم سے نکل جانے کو کہا۔ اس قرارداد کو امریکہ سمیت ۱۵ ممالک کے ووٹ ملے، نہ کوئی ملک غیر حاضر رہا نہ کسی نے اس کے خلاف ووٹ دیا۔

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ۴ جولائی ۱۹۶۷ کو قرارداد نمبر ۲۲۵۳ کے ذریعے اسرائیلی قبضہ کو غیر قانونی اور ناجائز قرار دیا۔ اس میں کہا گیا ہے کہ اسرائیل ہر ایسے اقدام سے باز رہے جو یروشلم شہر کی طے شدہ حیثیت کو تبدیل کرتا ہو۔ ۹۹ ممالک نے اس قرارداد کے حق میں ووٹ دیا اور کسی ایک ملک نے بھی اس کی مخالفت نہیں کی۔

تیرہ سال اس طرح گزر گئے۔ ۱۹۸۰ میں اسرائیل نے اقوام متحدہ کی قراردادوں کو پامال کرتے ہوئے اعلان کر دیا کہ یروشلم اس کا دارالحکومت ہوگا۔ اسرائیل نے دنیا سے کہا کہ وہ اپنے سفارت خانے یروشلم منتقل کرے۔ اس قدم سے اسلامی دنیا میں بھونچال آ گیا اور او آئی سی نے کہا کہ جو ملک اپنا سفارت خانہ یروشلم لے گیا تمام اسلامی ممالک سے اس کے سفارت خانے بند اور سفارتی تعلقات منقطع کر دیے جائیں گے۔ اس دوران اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے پہلے ۳۰ جون کو قرارداد نمبر ۴۷۶ اور پھر ۲۰ اگست ۱۹۸۰ کو قرارداد نمبر ۴۷۸ پاس کی اور اسرائیل کے اس قدم کو انٹرنیشنل لا کی خلاف ورزی قرار دیتے ہوئے تمام ممالک سے کہا کہ اقوام متحدہ کے فیصلہ کو مانیں اور کوئی ملک بھی اپنا سفارت خانہ یروشلم نہیں لے جائے گا۔ اس قرارداد کے حق میں ۱۴ ووٹ آئے جب کہ کسی ایک ملک نے بھی مخالفت نہیں کی۔ امریکہ البتہ غیر حاضر رہا؛ چناں چہ اس قرارداد کے فوراً بعد بولیویا، چلی، کولمبیا، کوسٹاریکا، پانامہ، یوروگوائے، وینزویلا، ایکواڈور، سالوا دور جیسے ممالک نے جو اپنے سفارت خانے یروشلم منتقل کر چکے تھے واپس تل ابیب لے کر آ گئے؛ حتیٰ کہ امریکہ کو بھی یہ ہمت نہ ہو سکی کہ وہ اپنا سفارت خانہ یروشلم لے جائے۔ دسمبر ۱۹۸۰ میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے اسرائیل کے اس اقدام کو غیر قانونی قرار دیا اور کہا کہ اسرائیل چوتھے جنیوا کنونشن کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔ وہ اس سے باز رہے۔

یروشلم کے بارے میں اقوام متحدہ واضح طور پر طے کر چکی ہے کہ یہ اسرائیل کا حصہ نہیں ہے۔ جنرل اسمبلی کی چار جولائی ۱۹۶۷ اور چودہ جولائی کی قراردادوں کے علاوہ سلامتی کونسل کی ۱۹۶۸ کی قرارداد نمبر 252 میں بھی یہی کہا گیا ہے کہ وہ ناجائز اور غیر قانونی اقدامات کر کے یروشلم شہر کی حیثیت بدل رہا ہے اس سے وہ اجتناب کرے۔

1990 میں اسرائیل کی جانب سے جب مسجد اقصیٰ میں مسلمانوں پر تشدد ہوا تو سلامتی کونسل نے 12 اکتوبر کو قرارداد نمبر 672 کے ذریعہ اسرائیل کو بین الاقوامی قوانین کی پامالی کا مرتکب ٹھہرایا اور کہا کہ یروشلم اسرائیل کا حصہ نہیں ہے؛ بل کہ یہ فلسطین کا علاقہ ہے جو اس وقت مقبوضہ حیثیت میں اسرائیل کے ناجائز قبضے میں ہے۔ اس قرارداد میں اسرائیل سے کہا گیا کہ وہ اس مقبوضہ علاقے میں ان ذمہ داریوں کو ادا کرے جو اقوام متحدہ کے قوانین کے تحت مقبوضہ علاقوں کی بابت طے کر دی گئی ہیں۔

یروشلم کی حیثیت کے تعین کے لیے یہ معاملہ 2004 میں بین الاقوامی عدالتِ انصاف کے پاس بھی پیش کیا گیا تا کہ اس سے ''ایڈوائزری اوپینین'' لیا جا سکے۔ بین الاقوامی عدالت انصاف نے کہا کہ یروشلم اسرائیل کا حصہ نہیں ہے بل کہ اسے مقبوضہ فلسطین کہا جائے گا۔ کہا گیا کہ اسرائیل یہاں دیوار تعمیر نہیں کر سکتا کیوں کہ یہ علاقہ اس کا نہیں ہے؛ بل کہ مقبوضہ ہے۔ یہ کام بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی ہے۔ عدالت نے تو یہ بھی کہا کہ جنرل اسمبلی اور سلامتی کونسل اس ضمن میں مزید اقدامات کریں۔

عالمی عدالت انصاف جس مقبوضہ علاقے میں ایک دیوار تعمیر کرنے کی اجازت نہیں دے رہی، آج امریکہ وہاں پورا سفارت خانہ لے جانا چاہتا ہے؛ یہاں اس غلط فہمی کو بھی دور کرلیا جائے کہ یہ محض ٹرمپ کا فیصلہ ہے۔ یادرہے کہ امریکہ تو 1995ء ہی میں یروشلم ایمبیسی ایکٹ متعارف کراچکا ہے۔ خواب پرانا ہے، اس خواب کو تعبیر البتہ ڈونلڈ ٹرمپ دے رہا ہے۔

اس وقت یروشلم کے معتبر ترین مسیحی رہ نما، گریک آرتھوڈوکس چرچ کے فیلوس الثالث اور درجن بھر دیگر مسیحی عمائدین نے ڈونلڈ ٹرمپ کو ایک احتجاجی خط لکھا ہے، جس میں انہیں وارننگ دی کہ سفارت خانہ یروشلم منتقل کرکے آپ ناقابلِ تلافی نقصان اٹھائیں گے۔ اور آپ کے اس اقدام سے یہاں نفرت، تشدد میں اضافہ ہوگا اور امن اور اتحاد سے ہم مزید دور ہوجائیں گے۔

معاملہ کا قانونی پہلو اب آپ کے سامنے ہے۔ امریکہ کے اس اقدام کی حمایت کرنے کے لیے دو میں سے ایک خوبی کا ہونا ضروری ہے۔

اول: آدمی جاہل ہو۔

دوم: وہ بددیانت ہو۔

تیسری صورت صرف یہ ہوسکتی ہے کہ اس میں یہ دونوں خوبیاں جمع ہوجائیں۔

تاریخی اعتبار سے، عالمی قانونی اعتبار سے، مذہبی اعتبار سے غرضیکہ ہر اعتبار اور پہلو سے بیت المقدس، مسجدِ اقصیٰ اور القدس شہر پر صرف اور صرف مسلمانوں ہی کا حق ہے؛ لہٰذا امریکہ کے اعلان کو کسی صورت میں قبول نہیں کیا جاسکتا، اور الحمدللہ! اس بارے میں ہونی ووٹنگ میں بھی امریکہ کو شکست سے دوچار ہونا پڑا ہے۔

امریکہ، اسرائیل، گوئٹے مالا، ہونڈیورس، دی مارشل آئسلینڈز، مائیکرونیشیا، نورو، پالاؤ اور ٹوگو ان چند ملکوں کو چھوڑ کر کسی نے اس کے حق میں فیصلہ نہیں دیا۔ وللہ الحمد علی ذالک!

(۱) اس موقع پر پاکستان کے وزیرِ اعظم جناب شاہد خاقان عباسی نے تین تجاویز پیش کرتے ہوئے کہا کہ اگر اسلامی کونسل اس مسئلے پر سنجیدگی نہیں دکھاتی، تو اس مسئلے کو اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی میں اٹھایا جائے۔

(۲) قابض صہیونی افواج کا تسلط ختم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تنظیم تعاونِ اسلامی اقتصادی طور پر بھی دباؤ ڈالے۔

(۳) اس مسئلے کو عالمی عدالتِ انصاف میں بھی اٹھایا جائے۔

کانفرنس کا انعقاد ترک صدر رجب طیب اردگان کی خصوصی دل چسپی کے باعث ممکن ہوا۔ اجلاس میں مسلم حکم رانوں نے عرصے بعد کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر امریکہ سے دوٹوک اور کھلے انداز میں بات کی؛ اسی اتحاد کی یہ دولت یہ ہوسکا ہے، کہ روس اور چین نے امریکی اقدام کی حمایت نہ کرنے کا اعلان کیا ہے۔

القدس سے متعلق امریکی فیصلہ کس قدر عاجلانہ اور جاہلانہ ہے کہ پوری دنیا سے کہیں بھی اس کی حمایت میں قابلِ ذکر آواز نہیں اٹھی۔انصاف پسند غیر مسلم شخصیات ،اداروں اور ملکوں نے حتیٰ کہ امریکہ ہی کے بے شمار شہریوں نے ٹرمپ کے اعلان کی مخالفت کی ہے۔صورتِ حال یہ ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ پوری دنیا ایک طرف اور صرف امریکی اشرافیہ اور اسرائیل ایک طرف ہے۔وینز ویلا کے صدر تو فلسطینی کاز کی حمایت میں او آئی سی کے اجلاس میں بھی شریک ہوئے۔اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ بیت المقدس کو اسرائیل کی گود میں دے دینا صرف مسلمانوں کی نگاہ میں نہیں، بل کہ ہر منصف مزاج شخص کی نظر میں انتہائی غلط، ناجائز اور غیر قانونی اقدام ہے۔

مسلم حکم رانوں کو اب بھی خیال کرنا چاہیے کہ او، آئی، سی (O.I.C) اجلاس کا معاملہ نشستن، گفتن وبرخاستن کا اور ''احتجاجی جلسہ'' کا نہیں ہونا چاہیے۔بل کہ عملی اقدام بھی اٹھانے چاہیے۔وہ باہمی رنجشیں بھلا کر اتحاد واتفاق کا مظاہرہ کریں اور امت کے سلگتے مسائل کے حل کے لیے سر جوڑ کر بیٹھیں اور کوئی قابلِ عمل حل تلاش کر کے اس پر عمل درآمد کرائیں۔آج وقت ہاتھ میں ہے، کل نکل جائے گا تو پھر الجھی ڈور کا سرا نہیں ملے گا۔

ہم امریکہ اور اس کے حواری موالی حلقوں کو بھی دعوتِ فکر دیتے ہیں، کہ وہ سوچیں کہ کسی قوم کو بہ زورِ طاقت عرصۂ دراز تک دبا کر رکھا نہیں جاسکتا۔من مانے فیصلے مسلط کرنے سے اشتعال ہی جنم لیتا ہے، اگر دنیا کو امن دینا مقصود ہے تو مسلم امہ کو اس کے غصب شدہ حقوق نہ صرف واپس کرنا ہوں گے، بل کہ اسرائیل جیسی دہشت گرد ریاستوں کی سرپرستی بھی چھوڑنا ہوگی۔

(''الصیانۃ'' جنوری ۱۸ء: مضمون نگار مولانا حنیف صاحب جالندھری)

اب سوال یہ کہ بیت المقدس کی بازیابی کیسے ممکن ہوگی؟ یہ ایک طویل الذیل عنوان ہے، جس کی طرف چند اشارات دیے جاتے ہیں:

فلسطین کی بازیابی کے لیے ہمہ جہتی تدابیر اختیار کرنی ہوں گی جس کو موٹے موٹے عناوین میں اس طرح تقسیم کیا جاسکتا ہے اور وہ یہ ہیں:

(الف) اللہ کی طرف رجوع:

(۱)......مسلمانوں کو انفرادی واجتماعی مسائل میں کامل طور پر اللہ کی طرف رجوع ہونا ہوگا۔

(۲)......عقیدے کا صحیح کرنا ضروری ہوگا۔

(۳)......آخرت پر ایمان کا مضبوط کرنا ضروری ہوگا۔

(۴)......نیت میں خلوص پیدا کرنا ہوگا۔

(۵)......تمام عبادات کا مکمل اہتمام کرنا ہوگا۔

(۶)......حسنِ اخلاق کو اختیار کرنا ہوگا۔

(۷)......سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا گہرائی سے مطالعہ کرنا ہوگا۔

(۸)......مسلمان معاشرے میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو عام کرنا ہوگا۔

(۹)......گناہوں سے سچی پکی توبہ کرنا ہوگا۔

(۱۰)......مالِ حلال کے کمانے کا اہتمام کرنا ہوگا۔

(۱۱)......اپنے آپ کو قدر و قضائے الٰہی پر راضی رکھنا ہوگا۔

(۱۲)......دشمنانِ اسلام سے دوستی کو ختم کرنا ہوگا۔

(۱۳)......نیک لوگوں کی سیرتوں کا مطالعہ کرنا ہوگا۔

(۱۴)......دنیا سے زہد اور بے زاری رکھنا ہوگا۔

(۱۵)......ہمیشہ موت کو یاد کرتے رہنا ہوگا۔

(۱۶)......علمی مجلسوں میں کثرت سے حاضری دینی ہوگی۔

(۱۷)......ہمیشہ اپنے آپ کو اللہ کی طرف متوجہ کرنا ہوگا۔

(ب) قضیہ فلسطین کی دینی حیثیت کو سمجھنے اور جاننے کی ضرورت ہے:

(۱۸)......مسلمانوں نے جن زمینوں کو فتح کے ذریعہ حاصل کیا ہے اس کے احکام جاننا ہوگا۔

(۱۹)......القدس اور اس کے ارد گرد اراضی کو بیچنا حرام ہے اس سے واقف ہونا ضروری ہے۔

(۲۰)......مسلمان اس مسئلہ سے بھی واقف ہوں کہ مقبوضہ فلسطین کو آزادی دلانا ان کا دینی فریضہ ہے۔

(۲۱)......دشمن خاص کر یہود کی ہر طرح کی چالبازیوں سے واقفیت ضروری ہے؛ تا کہ ان سے بچا جا سکے۔

(۲۲)......یہودیوں اور یورپی اقوام کے مشترکہ منصوبوں اور تعلقات سے واقف ہونا ضروری ہے۔

(۲۳)......اپنے گھر کے افراد کے سامنے قضیہ فلسطین کا مذاکرہ کرتے رہنا چاہیے؛ تا کہ ضرورت کے موقع پر وہ لوگ فلسطین کے لیے مر مٹنے کو تیار رہیں غافل نہ ہوں۔

(ج) قضیہ فلسطین سے اپنے متعلقین کو واقف کرنے کی بھر پور کوشش کرنا:

(۲۴)......اپنے دوست واحباب میں بھی فلسطین کے قبضہ کو موضوعِ بحث رکھنا چاہیے؛ تا کہ وہ بھی فلسطین کی خاطر قربانی دینے کے لیے تیار رہیں۔

(۲۵)......جن افراد کے ساتھ آپ کا سوشیل میڈیا، فیس بک، واٹس ایپ وغیرہ پر ربطہ ہو، انہیں بھی فلسطین سے متعلق معلومات دیتے رہنا چاہیے۔

(د) مسلمانوں میں وحدت کے لیے کوشش کرنا:

(۲۶)...... مسلمانوں کو آپسی اتحاد و اتفاق کی بھرپور کوشش کرنی چاہیے۔

(۲۷)...... مسلمانوں میں انتشار برپا کرنے والے کسی بھی طریقے سے دور رہنا چاہیے۔

(۲۸)...... اختلاف کے وقت کن آداب کی رعایت ضروری ہے، اس کو جاننا چاہیے۔

(۲۹)...... مسلمانوں کی آپسی مصالحت کی بھرپور کوشش جاری رکھنی چاہیے۔

(۳۰)...... مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق کے لیے صرف انفرادی کوشش پر اکتفا نہ کرے؛ بل کہ اجتماعی طور پر بھی کوشش جاری رکھے۔

(۳۱)...... اسلام میں شوریٰ کی کتنی اہمیت ہے اسے جان کر قیامِ شوریٰ کی کوشش جاری رکھنی چاہیے۔

(۳۲)...... مسلمانوں میں ان واقعات کو عام کرنا چاہیے، جو ماضی میں اتحادِ اسلامی کے نقیب رہے اور جن واقعات نے نہایت عمدہ اثرات چھوڑے۔ مثلاً: حضرت حسنؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کی مصالحت۔ عماد الدین زنگی نے ملکِ شام کے مختلف شہروں کو متحد کرلیا تھا جس سے فلسطین فتح ہوا۔

(ھ): مسلمانوں میں شوقِ جہاد پیدا کرنے کی کوشش کرنا:

(۳۳)...... امت کے نوجوانوں کو خاص طور پر لہو ولعب سے شوق ہٹا کر، جہاد کی روح ان میں بیدار کرنی چاہیے۔

(۳۴)...... موجودہ نسل کو ناچ گانے اور ہنسی مذاق کے مزاج ہٹا کر قرآن کی تلاوت سے شغف اور دینی امور سے دل چسپی پیدا ہو اس کی ہر طرح کے وسائل اختیار کرنے کوشش کرنی چاہیے۔

(۳۵)...... مسلمان ہر موقع پر اوقات کی مکمل پابندی کرے اس کا مزاج بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

(۳۶)...... مسلمان اپنے وقت صحیح مصرف میں استعمال کرنے کا عادی بننے کی کوشش کرنی چاہیے۔

(۳۷)...... شریعت نے جو رخصتیں دی ہیں اس کے علاوہ رخصتوں کی عادت نہ ڈال کر رخصت سے زیادہ عزیمت پر عمل کرنے کا عادی بنانے کی کوشش کرنا ضروری ہے۔

(و): مسلمانوں میں انفاق فی سبیل کا شوق پیدا کرنا

(۳۸)...... مسلمانوں میں اللہ کے راستے جان مال عزت قربان کرنے کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے ہر طرح کے وسائل کا استعمال اچھی طرح کرنا چاہیے۔

(۳۹)......خاص طور پر انفاق یعنی اللہ کے راستے میں مال خرچ کرنے مسلمان معاشرے کو عادی بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

(۴۰)......بچیوں میں بھی بچپن سے دین کی خاطر ہر طرح قربانی کا داعیہ پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

(۴۱)......اسلامی معاشرے میں ہر وقت نماز پڑھنے کا شوق پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

(ز): دشمنوں کی مصنوعات کا بائیکاٹ کرنے کا جذبہ پیدا کرنا:

(۴۲)......مسلمانوں میں دشمنانِ دین کی مصنوعات سے مکمل بائیکاٹ کا جذبہ بیدار کرنا ہوگا۔

(۴۳)......اپنی تقریروں اور خطبوں میں علما کو بار بار اسرائیلی بائیکاٹ کی دعوت دیتے رہنا چاہیے۔

(۴۴)......امت میں ایک ایسی جماعت کا ہونا ضروری ہے، جو بائیکاٹ مصنوعات کی لسٹ تیار کرے اور اسے معاشرے میں عام کرے، اس کے مقابلے اور متبادل کے طور پر کن مصنوعات کا استعمال کیا جائے، اس کی بھی لسٹ بنانی چاہیے۔

(۴۵)......مسلمانوں کو آپسی تعاون سے معاشرے کو پیش آمدہ تمام ضروری مصنوعات تیار کرنے کا پروگرام بنانا چاہیے۔

(۴۶)......ویب سائٹس اور موبائل ایپلیکیشن تیار کرکے امت کو بائیکاٹ اور مسجد اقصیٰ کی تاریخ سے متعلق صحیح معلومات مہیا کرنی چاہیے۔

(ح): علما اور خطبا کو امت میں نصرتِ الٰہی کی امید جگانا اور مایوسی کا خاتمہ کرنا:

(۴۷)......علما اور خطبا کو چاہیے کہ وہ امت کو مایوسی کے بجائے امید کی کرن اور روشنی دکھائیں اور بتلائیں کہ امتِ محمدیہ دنیا میں نہ ختم ہونے والی امت ہے؛ لہٰذا مایوس نہ ہوکر اپنے بل بوتے پر کھڑی ہوجائے۔

(۴۸)......مؤمنوں کو بتلائے کہ یہ معرکہ کافر اور مسلم کا نہیں؛ بل کہ حقیقی طور پر اللہ کے دشمنوں اور اس کے دوستوں کے درمیان ہے۔

(۴۹)......نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن وحدیث میں نصرت وتمکین کی جو بشارتیں بیان کی ہیں، اسے جمع کرکے بیان کیا جائے اور مسلمانوں کے حوصلے کو بلند کرے۔

(۵۰)......مسلمانوں نے ماضی میں بد سے بدتر حالات میں بھی کیسے فتح وکامرانی حاصل کی ہے، اس کے واقعات بیان کیے جائیں۔

(ط): صبر واستقامت کا جذبہ پیدا کرنا:

(۵۱)...... امت کو یہ بتلایا جائے کہ جب حالات بد سے بدتر ہوں اور مجاہدہ کی عادت پیدا ہو تب ہی اللہ کی مدد آتی ہے، اس کے لیے فقہ الابتلا اور سیرتِ صحابہ وانبیا کو بیان کیا جانا چاہیے۔

(۵۲)...... دشمنانِ اسلام کے سامنے شکست خوردگی کا اظہار کرنے سے احتراز کی تلقین کرنی چاہیے۔

(۵۳)...... مسلمانوں میں صبر وتحمل کی عادت ڈالنی چاہیے۔

(ی): مسلمانوں کی سیاسی وعلمی تاریخ سے امت کو روشناس کرنا:

(۵۴)...... آخری دور میں فلسطین کس طرح ہمارے ہاتھوں سے گیا، اس کو امت جاننے کی کوشش کرے۔

(۵۵)...... یہودیوں اور صیہونیوں کی تاریخ سے واقفیت۔

(۵۶)...... خلافتِ عثمانیہ کے دور میں قضیۂ فلسطین کے ساتھ کیا کیا گیا تھا، اس سے واقفیت۔

(۵۷)...... فلسطین کی وہ شخصیات، جن کا مزاحمتی تحریکات میں اہم رولت رہا ہے، ان کی واقفیت بھی ضروری ہے۔

غرض یکہ فلسطین کی بازیابی کے لیے روحانی، جسمانی، ظاہری، باطنی، سیاسی، اقتصادی، تعلیمی، فکری اور تربیتی ہر طرح کے وسائل کا استعمال مکمل طور پر کرنے کی ضرورت ہے۔ مذکورہ اسباب شیخ راغب سرجانی کی کتاب "فلسطين وواجبات الأمة" میں مذکور ہیں؛ اگر ہوسکے تو حضرات علماء کرام اس کتاب کا مطالعہ ضرور کریں، جس میں فلسطین کی بازیابی کے لیے ۱۳۵/ اسباب اختیار کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

ہم فلسطین کے لیے کیا عہد کریں؟

آیئے! اب عہد کرتے ہیں کہ فلسطین کے لیے صرف زبان خرچی کے طور پر اور تحریر وتقریر کی حد تک محبوس نہیں رہیں گے؛ بل کہ اس کے لیے عملی اقدام کریں گے اور امام غزالیؒ، عبد القادر جیلانیؒ اور امام الحرمین الجوینی کے طرز پر اولاً امت میں دینی بیداری پیدا کریں گے، اس کے بعد اپنی اولاد کو فلسطین کی آزادی کے لیے تیار کریں گے اور اگر موقع ہاتھ لگا تو اپنا سب کچھ اقصیٰ کی خاطر لٹا دیں گے، جان بھی مال بھی، عزت بھی، اولاد بھی اور سب کچھ۔ ان شاء اللہ!

اللہ ہمیں صحیح معنی میں قبلۂ اول کی بازیابی کے لیے کوشش کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے اور آزاد مسجدِ اقصیٰ میں نماز ہمارے لیے مقدر فرمائے۔ آمین یارب العالمین!

اے خدا رخ پھیر دے اب گردشِ ایام کے

ڈاکٹر فخر الاسلام مظاہری علیگ

”آخر کئی دن کی تلاش کے بعد ۱۰۰ کے قریب نائٹس (سنگین مجرم جن کا پیشہ ہی قتل و خونریزی تھی) کو سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کے خیمے میں لایا گیا، سلطان نے اُن کی بیویوں اور بیٹیوں کے سامنے انھیں زنجیروں سے آزاد کر دیا، پھر اُن عیسائی خواتین سے مخاطب ہوا جن کے شوہر جنگ میں مارے جا چکے تھے:

”میرے اختیار میں بس اتنا ہی تھا کہ زندہ انسانوں کے پیروں کی زنجیریں کاٹ دوں، اگر اس پر قادر ہوتا تو تمہارے مقتول شوہروں اور باپوں کو بھی واپس لے آتا۔“

یہ کہتے وقت صلاح الدین ایوبی کی آنکھوں سے آنسوں رواں تھے۔ پھر سلطان نے مقتول نائٹس کی بیویوں اور بیٹیوں کو حکومت کی خزانے سے اتنی کثیر رقم دی کہ وہ بے سہارا خواتین سلطان کے سپاہیوں کی حفاظت میں یروشلم سے جارہی تھیں، تو اُن کی آنکھوں سے تشکر کے آنسو رواں تھے اور سب عورتوں کی زبان پر ایک ہی جیسے کلمات جاری تھے۔

”بے شک! تم عظیم ہو؛ بل کہ عظیم تر اور ہمارے عیسائی حکمران ذلیل ہیں بل کہ ذلیل تر“

عیسائی خواتین نے سلطان صلاح الدین ایوبی کا بے مثال حسن سلوک دیکھ کر اُس واقعہ کی طرف اشارہ کیا تھا جب ۱۰۹۹ء میں صلیبیوں نے وحشیانہ طور پر یروشلم فتح کیا تھا۔ اُس وقت عیسائی سالار گارڈ فری اور ٹینکرڈ، اس شہر مقدس کی گلی کوچوں سے گزرتے تھے جو مسلمانوں کی لاشوں اور نیم جان جسموں سے پٹے پڑے تھے۔ بے کس و مجبور مسلمانوں کو اتنی اذیتیں دی گئیں کہ اس درندگی کی مثالیں تاریخِ انسانی میں بہت کم ملیں گی۔ اہل ایمان کو زندہ جلایا گیا اور انھیں (اپنی دانست میں) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مزار مبارک کی چھت پر لے جا کر ذبح کیا گیا۔“ (صلاح الدین ایوبی از خان آصف ص ۵۰۸/ مکتبہ الحق جوگیشوری ممبئی جون ۲۰۰۷)

سلطان صلاح الدین کی طرف سے کیا گیا کہ یہ سلوک اُس اصولی ہدایت اور تنبیہ کا اطلاقی نمونہ تھا جو رحمۃ للعالمین ﷺ کی جانب سے دی گئی تھی ”إنما تنصرون وترزقون لضعفائكم“ کہ کمزوروں پر رحم کروانہی کی وجہ سے خدا تعالیٰ کی طرف سے تمہاری مدد کی جاتی ہے اور تمہارے رزق میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی اسلامی ہدایات واحکام کی تعمیل میں نہایت غیرت مند اور حساس تھے۔ ان کا ایک واقعہ یہ ہے

کہ فتح کے بعد جب بعض لوگوں نے مشورہ دیا کہ یہاں کے لوگ نہایت سرکش ہیں، نرم اسلامی احکام ان کے لیے کافی نہ ہوں گے، اس لیے بعض سخت قوانین بنائے جانے چاہئیں، تو سلطان نے جو جواب دیا، حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: وہ جواب آب زر سے لکھنے کے قابل ہے، سلطان نے فرمایا: میں نے اپنی حکومت قائم کرنے کے لیے اور لوگوں کو اپنا تابع فرمان بنانے کے لیے ملک فتح نہیں کیا ہے بل کہ مقصود اللہ اور اس کے رسول کے احکامات جاری کرنا ہے خواہ وہ احکام سخت ہوں یا نرم۔

یروشلم یا بیت المقدس - جسے سلطان الملک الناصر صلاح الدین ایوبی (۵۳۲ھ/۱۱۳۸ء - ۵۸۹ھ/۱۱۹۳ء) نے ایک جنگِ عظیم کے بعد فتح کیا تھا- کی تاریخی حیثیت یہ ہے کہ ہزاروں سال پہلے عرب قبائل یہاں آکر آباد ہوئے۔ ارضِ فلسطین - جہاں بیت المقدس واقع ہے۔ کو ارضِ کنعان بھی کہا جاتا ہے، کیوں کہ یہاں کنعانی نسل کے بہت سے قبیلے رہ چکے ہیں، بعد ازاں اِسے یورسالم اور یروشلم کہا جانے لگا ۱۰۰۰ (ایک ہزار) ق م میں حضرت داؤد علیہ السلام نے اسے اپنی حکومت کا دارالسلطنت بنایا، اس کے بعد ۹۶۰ ق م میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہاں معبد تعمیر کروایا جسے ہیکل سلیمانی کہا جاتا ہے۔ ۵۸۹ ق م میں بخت نصر نے شہر کو تاراج کر کے یہودیوں کو ملک بدر کیا۔

۱۶ھ میں حضرت عمر ابن الخطابؓ کے عہد خلافت میں یہ علاقہ مسلمانوں کے زیر نگیں آیا اور عیسائیوں نے اپنی مذہبی پیشن گوئیوں سے مطابقت کرتے ہوئے خلیفہ ثانی کو بیت المقدس کی چابیاں سپرد کیں، تو اُس وقت اس کا نام تبدیل کر کے بیت المقدس رکھا گیا۔ تقریباً ۵۰۰ (پانچ سو) سال تک مسلسل یہ شہر مسلمانوں کے پاس رہا۔ پھر جب عباسی حکمراں کمزور پڑے، تو صلیبیوں نے اِس پر قبضہ کرلیا۔ ۹۸ سال تک () یہ شہر غیر مسلموں کے پاس رہا، یہاں تک کہ ۱۱۸۸ء میں مجاہد اعظم سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے اِسے دوبارہ فتح کر کے اسلامی شہروں کی فہرست شامل کرلیا۔ (روزنامہ "خبریں" ۱۵ ستمبر ۲۰۱۷ء)

گزشتہ سطور میں اجمالی اشارہ گزر چکا ہے کہ عیسائیوں نے جب بیت المقدس کو مسلمانوں سے ۱۰۹۹ء میں چھینا تو انھوں نے مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہادی تھیں؛ لیکن سلطان صلاح الدین ایوبی نے جب اس مقدس شہر کو صلیبیوں سے فتح کیا تو کسی عیسائی باشندے کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا؛ بل کہ اُن کے لیے یہ رعایت رکھی کہ اگر بیت المقدس محض زیارت کے لیے آئیں تو عیسائیوں کو کسی قسم کی روک ٹوک نہیں کی جائے گی۔ فلسطین کی اسلامی سلطنت پر کچھ عرصہ کے لیے ایک بحران دوبارہ پیدا ہوا، یعنی عیسائیوں کا تسلط ہوا؛ لیکن پھر ۱۵۱۷ء میں سلطان سلیم اول نے اِس کو عثمانی سلطنت میں شامل کرلیا۔

اس کے ٹھیک چہارصد سال بعد ۱۹۱۷ء گردشِ ایام کا رُخ مُڑ گیا اور اسلام اور مسلمان دشمن قوموں کے ذریعہ وقت کی سُپر پاور ایمپائر برطانیہ کی سرپرستی میں ایک دوررس سازشی جال کا تانا بانا بُنا گیا۔ ۱۱؍دسمبر ۱۹۱۷ء کو برطانوی جنرل سرایڈ منڈ ایلن بے نے (فلسطینیوں کی حمایت سے اُن کے وطن کو آزادی دلانے کے نام پر) ترک فوجوں کو شکست دے کر فلسطین پر قبضہ کیا۔ اس موقع پر امریکی اخبار نیویارک ہرالڈ نے واقعہ کے لیے یہ سرخی جمائی: ''برطانیہ نے ۶۷۳ برس کے اقتدار کے بعد یروشلم کو آزاد کروالیا ہے۔''

(روزنامہ ''خبریں'' ۸ ستمبر ۲۰۱۷ء)

یہ ٹائٹل اشاروں میں مذکورہ سازش کی طرف ہی دلالت کرتا ہے۔ واقعہ یہ پیش آیا کہ برطانوی وزیر خارجہ بالفور نے یہودیوں کے لیے مستقل ملک کی تجویز رکھی۔ اس تجویز نے فلسطین کے سقوط وزوال کے لیے مکرِ عظیم اور پیچ در پیچ پالیسی کی راہ ہموار کی اور فلسطینی مسلمانوں کے لیے برطانیہ، امریکہ اور اسرائیل کی جانب سے کی جانے والی منظم سفاکی اور درندگی کا باب کھول دیا۔

سازش! بلفور ڈکلیریشن! غیور عرب فلسطین

۲؍نومبر ۱۹۱۷ء کو جب پہلی جنگ عظیم پورے شباب پر تھی، برطانوی وزیرخارجہ آرتھر جیمس بیلفور نے ایک مختصر سا اعلامیہ جاری کیا تھا... آج سے ٹھیک ایک صدی قبل اس کے تحریر کردہ مختصر سے (محض ۶۷؍الفاظ پر مشتمل) خط نے۔ جسے دنیا بیلفور ڈکلریشن کے نام سے جانتی ہے۔ اسرائیل کے قیام کی راہ ہموار کی تھی اور یہی دستاویز دنیا کے سب سے پیچیدہ اور سرکش تنازع کی بنیاد تھی۔ اگر یہ تنازع ۱۰۰؍برسوں میں بھی حل نہیں کیا جاسکا ہے تو اس کے لیے بھی برطانوی سلطنت کی روایتی ریاکاری، مکاری اور وعدہ خلافی ذمہ دار ہے۔

یہ خط جو بیلفور نے برطانیہ کے صیہونی لیڈر اور ایک بڑے بینکر لارڈ راتھس چائلڈ کو لکھا تھا۔ دراصل یہ ایک اقرارنامہ تھا جس میں برٹش حکومت نے یہودیوں کے لیے فلسطینی سرزمین پر علاحدہ 'قومی لینڈ' کے قیام میں مدد کا وعدہ کیا تھا... برطانوی وزیر اعظم ڈیوڈ لائڈ جارج نے یورپ اور امریکہ کے بااثر اور دولت مند یہودیوں کی حمایت اور مالی مدد حاصل کرنے کی غرض سے صیہونی تحریک کی حمایت کی حکمت عملی اپنائی تھی کیوں کہ انہیں یہ یقین تھا کہ جرمنی کو ہرانے اور جنگ جیتنے کے لیے یہ مدد ضروری ہے۔

اس اعلامیہ میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ یہودی ایسا کچھ بھی نہیں کریں گے جس سے فلسطین کے مقامی باشندوں کے بنیادی شہری اور مذہبی حقوق متاثر ہوں لیکن یہ سطر محض رسمی خانہ پری کی خاطر لکھی گئی تھی.........

اُس وقت اُس سرزمین پر ۹۰ فیصد سے زیادہ آبادی عربی بولنے والے فلسطینیوں کی تھی۔ اقرارنامے میں 'عرب'، 'مسلم'، 'عیسائی' الفاظ عمداً تحریر نہیں کیے گئے، نہ ہی اس سرزمین کے مستقبل کا فیصلہ کرتے وقت اس کے اصل باسیوں سے کوئی

صلاح مشورہ کیا گیا...... برطانیہ نے کاغذ کے ایک ٹکڑے کے ذریعہ اس سرزمین پر صدیوں سے رہائش پذیر عرب باشندوں کو اپنے ہی گھروں میں اجنبی بنا دیا اور دنیا کے دور دراز علاقوں میں آباد یہودیوں کو وہاں لا کر ان کے گھروں کی ملکیت عطا کر دی۔ اس کھلی ناانصافی کو ایک انصاف پسند یہودی ادیب نے نہایت عمدہ الفاظ میں یوں بیان کیا:

"ایک قوم نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ دوسری قوم کو تیسری قوم کے ملک کو سونپ دینے کا وعدہ کر لیا۔"

انگریزوں نے قدم قدم پر عربوں اور فلسطینیوں کو دھوکہ دیا۔ انھوں نے عربوں کو آزادی دلوانے کا جھوٹا خواب دکھا کر سلطنت عثمانیہ کے خلاف بغاوت پر اکسایا۔ جب ان (فلسطینیوں) کی مدد سے برطانیہ نے ترکی کو شکست دے دی اور سلطنت عثمانیہ کا شیرازہ بکھر گیا تو انگریزوں نے فلسطین پر قبضہ کر لیا؛ لیکن فلسطینیوں کو آزادی دینے کے بجائے برطانیہ نے ان کی زمین یہودیوں کو سونپ کر انہیں دائمی طور پر ان (یہودیوں) کی جابرانہ غلامی عطا کر دی۔ .....لیگ آف نیشنز (اقوام متحدہ کا پیشرو) نے نہ صرف بالفور ڈکلیریشن کی توثیق کر دی؛ بل کہ برطانیہ کو.... اس پر عمل در آمد کی ہدایت بھی دے دی۔ لیگ آف نیشنز نے Mandate for Palestine نام کا ایک عالمی حکم نامہ بھی جاری کر دیا جس کے تحت یہودیوں کو یہ قانونی اختیار دے دیا گیا کہ وہ مغربی فلسطین میں دریائے اردن اور بحیرہ روم کے درمیان کسی جگہ بھی رہ سکتے ہیں۔ اس کے بعد تو دنیا کے کونے کونے سے یہودی ہزاروں کی تعداد میں اپنا گھر بار چھوڑ کر فلسطین پہنچنے لگے۔ ۱۹۳۳ء میں جرمنی میں ہٹلر کے اقتدار میں آنے کے بعد فلسطین میں یہودیوں (کی آمد) کا تانتا بندھ گیا۔ مقامی یہودیوں کے ساتھ عرب باشندے صدیوں سے فلسطین میں پُر امن طریقے سے رہتے آئے تھے؛ لیکن اب مسئلہ یہ تھا کہ بیرونی ممالک سے ہزاروں کی تعداد میں جو تارکین وطن فلسطین آ رہے تھے وہ کٹر صیہونی نظریہ کے حامل تھے۔ انہیں عربوں سے سخت نفرت تھی اور ان کا یہ یقین تھا کہ وہ فلسطینی سرزمین کے بلا شرکت غیرے مالک ہیں۔ نسلی برتری کے تکبر اور مذہبی منافرت کے جذبات سے چور ان نو واردوں نے بہت جلد مقامی عربی باشندوں کے ساتھ بدسلوکی اور مار پیٹ شروع کر دی۔ ظاہر ہے عربوں نے مزاحمت کی اور نتیجے میں فلسطین میں قتل و غارت گری کی وارداتیں شروع ہو گئیں۔ وہاں تعینات برطانوی فوج نے مکمل طور پر صیہونیوں کی پشت پناہی کی اور عربوں پر ظلم و استبداد کے پہاڑ توڑ ڈالے۔ ۱۹۳۶ء میں عربوں نے کھل کر برطانوی سامراج کے خلاف بغاوت کر دی جو تین سال تک چلی۔ انگریزوں نے اس عوامی بغاوت کو کچلنے کے لیے ۳۰ ہزار فوجیوں کا سہارا لیا، جس میں ۱۰ ہزار سے زیادہ فلسطینی مارے گئے۔ سینکڑوں افراد کو گرفتار کر لیا گیا، ۲ ہزار سے زیادہ گھروں کو مسمار کر دیا گیا اور سو سے زائد لوگوں کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ انگریزوں کے شانہ بشانہ صیہونی دہشت گرد بھی فلسطینیوں کے خلاف محاذ آرائی کر رہے تھے..... "۱۹۴۷ء میں اقوام متحدہ نے شہر کو فلسطینی اور یہودی حصوں میں تقسیم کر دیا" اور پہلے سے طے شدہ پلان کے مطابق برطانیہ نے فلسطین کا علاقہ خالی کر دیا اور ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کے دن اسرائیل معرض وجود میں آیا۔ باہری لوگوں کو وہاں بسانے کے لیے پہلے

مقامی افراد کا قتل عام کیا گیا۔ تقریباً ۵۰۰ گاؤں کو تباہ و برباد کر دیا گیا اور وہاں کے ساڑھے ۷/لاکھ اصلی باسیوں کو جبراً جلاوطن کروایا گیا۔ ایک طرح سے فلسطینی عربوں کی نسل کشی کی گئی۔ ۱۹۴۸ء میں تاریخی فلسطین کا ۷۸ فیصد علاقہ اسرائیل کے قبضے میں تھا؛ لیکن صہیونیوں نے اس پر بھی اکتفا نہیں کیا۔ ۱۹۶۷ء میں ۵ روزہ جنگ کے دوران اسرائیلی فوج نے مکمل فلسطین پر تسلط قائم کر لیا اور اس کے ساتھ ہی شام اور مصر کے علاقوں پر بھی قبضہ کر لیا۔ جنگ کے خاتمے تک اسرائیل نے مزید ساڑھے ۴/لاکھ فلسطینیوں کو ان کے گھروں سے نکال کر ان کی زمینوں پر قبضہ کر لیا۔

پچھلے ۵۰/برسوں سے ۵۰/لاکھ سے زیادہ بدنصیب فلسطینی مہاجر اردن، شام، لبنان، مصر، عراق اور دیگر ممالک میں پناہ گزین ہیں۔ جو لوگ مغربی کنارہ، یروشلم اور غزہ جیسے فلسطینی علاقوں میں رہائش پذیر ہیں اُن کی حالت بھی بے حد دردناک ہے۔ ایک پوری قوم کی اس المناک بربادی کا آغاز بیلفور کی اس مختصر سی تحریر سے ہوا تھا جس کا صد سالہ جشن ۲/نومبر کو لندن اور تل ابیب میں منایا گیا۔ برطانوی وزیرِ اعظم تھیریسا مے کی دعوت پر اسرائیل کے وزیرِ اعظم بنجامن نتن یاہو نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے لندن کے اس ڈنر میں شرکت کی۔ انہوں نے نتن یاہو کے سامنے یہ اعلان کیا کہ برطانیہ نے اسرائیلی ریاست کے قیام میں جو کردار ادا کیا ہے، اس پر اسے فخر ہے۔" (روزنامہ 'خبریں' اعلان بالفور... از پرویز حفیظ نومبر ۲۰۱۷)

فلسطینی قوم کی حق خودارادیت اور بیت المقدس میں یہودی آبادکاری:

"۱۹۹۳ء میں فلسطینی اتھارٹی اور اسرائیل کے درمیان تقسیم کردہ اراضی میں فلسطینی اتھارٹی کے حصے میں آنے والے علاقے بھی مسلسل صہیونی توسیع پسندی کے نرغے میں ہیں۔ یہودی آبادکاری کیوں قابل مذمت ہے؟ اس کا جواب واضح اور روداروو چار کی طرح سیدھا سادا ہے۔ یہودی آبادکاری آزاد فلسطینی ریاست کے قیام کے لیے پیغام موت ہے۔ یہودی توسیع پسندی اور آبادکاری فلسطینی مملکت کے قیام کے خواب کو شرمندہ تعبیر ہونے سے روکنے کا ایک حربہ، آزاد فلسطینی مملکت اور فلسطینی قوم کی امنگوں، ان کے حق خودارادیت کے لیے 'آلۂ قتل' ہے۔ ایک ملین گھر منصوبہ سال ۲۰۱۷ء فلسطین میں یہودی آبادکاری کا انتہائی خطرناک سال قرار دیا جا رہا ہے۔ یہودی آبادکاری کے منصوبوں میں انتہائی خطرناک وہ منصوبہ ہے جس کا اعلان حال ہی میں اسرائیلی وزیر برائے ہاؤسنگ یواف گالانٹ نے کیا۔ گالانٹ کا کہنا تھا کہ وہ اگلے ۲۰ سال کے دوران فلسطینی علاقوں میں ۱۰/لاکھ مکانات تعمیر کرنے کا منصوبہ رکھتے ہیں۔ ان میں سے ۳۰ فیصد یعنی قریبا تین لاکھ گھر بیت المقدس میں تعمیر کیے جائیں گے۔ یہ تین لاکھ گھروں کی تعمیر دراصل صہیونی ریاست کے 'عظیم تر یروشلم' کے نام نہاد غاصبانہ پروجیکٹ کا حصہ ہے۔"

('روزنامہ خبریں' ۴/جنوری ۲۰۱۸)

’’غزہ کی معاشی ناکہ بندی دس سال سے جاری ہے۔ اس دوران کم از کم دس ہزار مسلمان اسرائیلی فوجوں کی گولہ باری اور فائرنگ نیز بھکمری اور دواؤں کی قلت کا شکار ہو کر ہلاک ہو چکے ہیں۔ اور غزہ کے جن مسلمانوں کو اس عرصے میں اسرائیلی ٹینکوں اور جنگی طیاروں نے بے خانماں کیا ہے ان کی تعداد تو ہلاک ہونے والوں سے دسیوں گنا زیادہ ہے!‘‘ (عالم نقوی: ’روزنامہ انقلاب‘ ۱۳/ستمبر ۲۰۱۷))

ابتدا میں جس وقت ’’اسرائیل نام کی مملکت قائم کرنے کا کا اعلان کیا گیا تھا، اُس وقت تک سابقہ خلافتِ عثمانیہ کا حصہ رہے تمام مسلم ممالک پوری طرح بکھر چکے تھے اور ہر جگہ برطانیہ نواز حکمراں بیٹھ چکے تھے، اس لیے فلسطین کے مظلوم مسلمانوں کی مدد کرنے والا کوئی نہ تھا۔‘‘ (شکیل شمسی: ’روزنامہ انقلاب‘ ۱۸/دسمبر ۲۰۱۷)

صحافی عالم نقوی لکھتے ہیں: ’’اور ستر سال قبل بھی دنیا میں مسلمانوں اور ان کی حکومت والے ملکوں کی تعداد کچھ کم تو نہیں تھی لیکن کیا وہ اپنے اندر پیدا ہو جانے والی داخلی خرابیوں کی بدولت قلب مسلم میں صہیونی خنجر کو پیوست ہونے سے روک سکے؟‘‘ ’’اگر ایران، ترکی، سعودی عرب، متحدہ عرب امارات وغیرہ نے غزہ کو اکیسویں صدی کا شعب ابی طالب بننے سے بچا لیا ہوتا اور ظالموں کو سبق سکھا دیا ہوتا تو میانمار کے بودھوں کی بھلا کیا مجال تھی کہ وہ یہودیوں کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے۔‘‘ (عالم نقوی: ’روزنامہ خبریں‘ ۱۳/ستمبر ۲۰۱۷)

اسلامی تعاون تنظیم:

اسلامی تعاون تنظیم (او آئی سی) اقوام متحدہ کے بعد دنیا کی دوسری سب سے بڑی بین المملکتی تنظیم ہے جس میں مشرق وسطیٰ، شمالی، مغربی وجنوبی افریقہ، وسط ایشیا، یورپ، جنوب مشرقی ایشیا، برصغیر اور جنوبی امریکہ کے ۵۷ مسلم اکثریتی ممالک شامل ہیں۔ اس کے علاوہ مشاہدین کے طور پر بھی کئی ممالک شامل ہیں، ہندوستان بھی تیسرا سب سے بڑا مسلم اکثریتی ملک ہونے کی وجہ سے گزشتہ کئی سالوں سے اس کی رکنیت کا خواہاں ہے.... اس کے علاوہ فلپائن، سری لنکا، نیپال، جمہوریہ کانگو اور سربیا جیسے ممالک بھی او آئی سی میں اپنی شمولیت چاہتے ہیں۔

۲۱/اگست ۱۹۶۹ء میں مسجد اقصیٰ پر یہودی حملے کے بعد عالمی سطح پر مسلمانوں کے لیے ایک متحدہ پلیٹ فارم کی تشکیل کا خاکہ پیش کیا گیا اور اگلے ہی ماہ ۲۵ ستمبر ۱۹۶۹ء کو مراکش کے شہر رباط میں ایک اسلامی تعاون تنظیم کا قیام عمل میں لایا گیا، جسے Organisation of Islamic Cooperation کہا جاتا ہے اور عربی میں اس کا نام ’’منظمۃ التعاون الاسلامی‘‘ ہے۔ اسلامی تعاون تنظیم کے قیام کا مقصد امت مسلمہ کے مسائل کا حل کرنا، دنیا بھر کے مسلمانوں کی سیاسی، سماجی، اقتصادی اور تعلیمی پسماندگی کا جائزہ لینا، مسلمانوں کی خبر گیری کرنا، ان پر ہونے والے ظلم وزیادتی کے خلاف آواز اٹھانا اور قیادت ورہنمائی کا فریضہ انجام دینا ہے۔ ان سب کے ساتھ فلسطین کی بازیابی، مسجد اقصیٰ کا تحفظ اور اسرائیلیوں کے مظالم سے اہل غزہ کو محفوظ رکھنا او آئی سی کے اغراض ومقاصد میں سرفہرست ہے۔

ہر تین سال پر اسلامی تعاون تنظیم میں پالیسی تربیت دینے کے لیے تمام رکن ممالک کے سربراہوں کا اجلاس منعقد ہوتا ہے اور سال میں ایک مرتبہ فیصلوں پر عمل درآمد کی صورتِ حال اور غور و خوض کے لیے وزرائے خارجہ کا اجلاس طلب کیا جاتا ہے۔ او آئی سی کا مستقل دفتر سعودی عرب کے شہر جدہ میں قائم ہے۔ او. آئی. سی. کو متحرک و فعال رکھنے اور اپنے مقصد میں کارآمد بنانے کے لیے مندرجہ ذیل کمیٹیاں بھی قائم ہیں۔ القدس کمیٹی، اطلاعات و ثقافتی معاملات کی قائمہ کمیٹی، اقتصادی و تجارتی معاملات کی قائمہ کمیٹی، سائنس و ٹیکنالوجی کے شعبے میں تعاون کی قائمہ کمیٹی، اسلامی کمیٹی برائے اقتصادی، ثقافتی و سماجی معاملات، مستقل تجارتی کمیٹی۔ اسلامی تعاون تنظیم کے اب (دسمبر ۲۰۱۷ء میں یروشلم کو اسرائیلی راجدھانی بنانے کے اعلان سے پہلے) تک کل تیرہ سربراہ اجلاس ہو چکے ہیں۔ دنیا کے مختلف مقامات پر تیرہ مرتبہ مسلم ممالک کے رہنما ایک ساتھ جمع ہو چکے ہیں، لیکن وہ اب تک لفظوں کی دنیا سے آگے نہیں بڑھ سکے ہیں، نشستن، گفتن اور برخاستن سے آگے کچھ نہیں کر پا رہے ہیں۔ ہر اجلاس میں امتِ مسلمہ کے مسائل کو حل کرنے کا دعویٰ کرنا، امت کو درپیش مشکلات سے نجات دلانے کا عزم کرنا اور عالمِ اسلام کی مشترکہ قیادت کا دم بھرنا اس تنظیم کی شناخت بن گئی ہے۔

۱۴/۱۵/ اپریل ۲۰۱۶ء کو تنظیم کا تیرہواں سربراہی اجلاس ترکی کی صدارت میں استنبول میں منعقد ہوا ہے جس میں ایک مرتبہ پھر وہی پرانے جملے دہرائے گئے، عالم اسلام کے مسائل کو حل کرنے کا دعویٰ کیا گیا، اتحاد اتفاق قائم کرنے کی اپیل کی گئی۔ دوسروں کی دہلیز پر دستک دینے کے بجائے از خود معاملات حل کرنے کی ضرورت و اہمیت بتائی گئی۔ خادم الحرمین الشریفین شاہ سلمان نے کہا کہ ہم امت مسلمہ کے مسائل حل کرنا چاہتے ہیں، مسئلہ فلسطین کا حل ہماری اولین ذمہ داری ہے... انھوں نے مزید کہا کہ ''آج ہمارے عالم اسلام کو درپیش تنازعوں اور بحرانوں کے ضمن میں متعدد اسلامی ملکوں کو اپنے امور میں مداخلت، فتنوں کے بھڑکائے جانے، تقسیم اور ٹوٹ پھوٹ فرقہ وارانہ اور مسلک پرستانہ نعروں کی گونج کا سامنا ہے،.... یہ تمام چیزیں ہم سے ایک سنجیدہ رویے کا مطالبہ کرتی ہیں تاکہ ان مداخلتوں کو روکا جا سکے اور عالم اسلام کے امن اور سلامتی کو برقرار رکھا جا سکے''۔ میزبان ملک ترکی نے دہشت گردی اور تشدد کو عالم اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ گردانتے ہوئے کہا کہ پہلے القاعدہ تنظیم کی وجہ سے افغانستان تباہ ہوا اور اب داعش تنظیم حرکت الشباب اور بوکو حرام کے سبب یہ امر پھر سے دہرایا جا رہا ہے۔ ترکی کے صدر نے مغربی ممالک کے دہرے معیار کو شدید تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہا کہ ''ان ممالک نے انقرہ استنبول اور لاہور حملوں سے تو چشم پوشی کر لی اور تمام توجہ برسلز پر مرکوز کر دی۔

امت کا سب سے بڑا مسئلہ مسئلہ فلسطین ہے، اسی کے پس منظر میں یہ تنظیم قائم ہوئی تھی؛ لیکن ۴۶ سالوں کا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود دیگر امور کے ساتھ فلسطین کا مسئلہ بھی حل ہونے کے بجائے مزید پیچیدہ ہوتا جارہا ہے۔ غزہ کا محاصرہ سب سے بڑا انسانی المیہ ہے، انسانیت ناقابلِ بیان بحران سے دوچار ہے۔ مصر کی سرحد بند ہونے کی وجہ سے اہلِ غزہ جانوروں سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ اپنی پریشانیوں سے تنگ آکر سالِ رواں غزہ کا محاصرہ ختم کرانے کے سلسلے میں فلسطین کی سرکاری کمیٹی نے ایک بیان جاری کرکے اسلامی تعاون تنظیم کے تیرہویں سربراہی اجلاس کے شرکاء سے درخواست کی تھی کہ غزہ کے محاصرے کو ختم کرانے کے مسئلے کو اپنے ایجنڈے میں سرفہرست قرار دیں۔

مصر پر دباؤ بنائے کہ وہ غزہ کا محاصرہ ختم کرنے کے لیے مصری گزرگاہ رفح کھول دے اور مسافروں بالخصوص بیماروں اور طلباء کی آمد و رفت کے لیے سہولتیں فراہم کریں؛ لیکن افسوس کہ او آئی سی کے رکن ممالک ہی فلسطین کے مسئلے کو پیچیدہ بنا رہے ہیں، ایک طرف مصر نے اپنی سرحدیں بند کر رکھی ہے، تو دوسری طرف سعودی عرب حماس کو دہشت گرد جماعت قرار دینے کے ساتھ مصر کی مکمل حمایت کر رہا ہے۔"

(شمس تبریز قاسمی: او آئی سی کا اجلاس، روزنامہ خبریں ۲۱/اپریل ۲۰۱۶)

امریکی صدر ڈونالڈ ٹرمپ کے یروشلم کو اسرائیل کی راجدھانی تسلیم کرنے اور وہاں امریکی سفارت خانہ منتقل کرنے کے اعلان کے بعد اور خود فلسطینی قیادت کا ایک جائزہ رمزی بارود نے پیش کیا ہے، وہ لکھتے ہیں ''استنبول میں منعقدہ اسلامی تعاون تنظیم (او آئی سی) کے ہنگامی سربراہ اجلاس میں فلسطینی اتھارٹی کے صدر محمود عباس نے معطل ''امن عمل'' میں اپنا کردار اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے ۱۳ دسمبر کو او آئی سی کی اس سربراہ کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ان کی اتھارٹی اب مشرقِ وسطیٰ امن عمل میں امریکہ کی مصالحت کو قبول نہیں کرے گی۔

انہوں نے مسلم اکثریتی ممالک سے تعلق رکھنے والے شریک سربراہان اور وزراء سے خطاب میں کہا کہ امریکی صدر ڈونالڈ ٹرمپ کے القدس (یروشلم) کو اسرائیل کا دار الحکومت تسلیم کرنے کے بعد اب واشنگٹن مصالحت کار کے طور پر ''فٹ'' نہیں رہا ہے۔ اس کے بجائے محمود عباس نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اب اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل مصالحت کار کا کردار ادا کرے۔''

محمود عباس کے اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے رمزی بارود لکھتے ہیں:

"لیکن سوال یہ ہے کہ انہوں نے یہ اعلان کرنے کے لیے اتنا طویل انتظار کیوں کیا ہے؟ نیز اب وہ اپنا آخری کھیل کیا کھیلنا چاہتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ ۲۰۰۰ء میں کیمپ ڈیوڈ اجلاس کی ناکامی کے بعد کوئی امن عمل نہیں رہا ہے۔ اس اجلاس کے میزبان سابق امریکی صدر بل کلنٹن تھے اور یہ دراصل ان کا اور اُس وقت کے اسرائیلی وزیر اعظم ایہود باراک کا ایک جال تھا جو انہوں نے فلسطینی اتھارٹی کے لیڈر مرحوم یاسر عرفات کو پھانسنے اور دباؤ میں لانے کے لیے بچھایا تھا تا کہ وہ یروشلم پر فلسطینی حقوق سے دستبردار ہو جائیں۔ یاسر عرفات اپنی بہت سی سیاسی غلطیوں کے باوجود ایک غیر تحریری تجویز کو مسترد کرنے کی حس رکھتے تھے۔ اس تجویز میں در اصل مقبوضہ شہر پر فلسطینیوں کی خود مختاری کو تسلیم کرنے سے انکار کیا گیا تھا اور اس کے بجائے انہیں مغربی کنارے کے ملحقہ علاقوں پر محدود خود مختارانہ کنٹرول دیا گیا تھا۔ جب مرحوم یاسر عرفات نے امریکہ، اسرائیل کے دباؤ کے آگے جھکنے سے انکار کر دیا اور بغاوت کر دی، تو اسرائیلی فوجیوں نے راملہ میں ان کے دفتر کا گھیراؤ کر لیا۔ انہوں نے یہ محاصرہ ۲۰۰۴ء تک برقرار رکھا تا آنکہ یاسر عرفات علیل ہو گئے۔ انہیں علاج کے لیے ایک فضائی ایمبولینس کے ذریعے پیرس منتقل کر دیا گیا اور وہیں وہ ایک اسپتال میں انتقال کر گئے تھے۔

اس کے فوری بعد محمود عباس نے فلسطینی اتھارٹی کا کنٹرول سنبھال لیا تھا۔ انہوں نے معطل امن عمل کو بحال کیا اور پھر آنے والے برسوں میں اس کی غوغا آرائی کی جاتی رہی تھی۔ وہ اپنے مقہور عوام کا از کار رفتہ اور خالی خولی نعروں سے دل بہلاتے رہے تھے اور جو ان سے عدم اتفاق کی جسارت کرتے تھے، انہیں وہ سزا دیتے تھے۔ درحقیقت محمود عباس اور اسرائیلی وزیر اعظم بنیامین نیتن یاہو نے امریکی ڈھونگ میں اپنا اپنا کردار خوب نبھایا ہے۔

محمود عباس نے قریباً ربع صدی فضول بات چیت میں گنوا دی ہے۔ ان کا صرف ایک ہی مقصد ہے کہ وہ خود کو اور چند ایک اور فلسطینیوں کو منظر نامے میں برقرار رکھنا چاہتے ہیں؛ لیکن اب تک بہت ہو چکی ہے، اب امریکی چہرے سے نقاب مکمل طور پر اُتر چکا ہے۔ فلسطینیوں کو اپنی سیاسی ترجیحات، اتحاد اور قومی آزادی کی حکمتِ عملی پر فوری طور پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔ اگر فلسطینی قیادت میں خود احتسابی اور ذاتی احترام کا ذرا سا بھی مادہ موجود ہے، تو پھر اُس کو فلسطینی عوام سے صدقِ دل سے وقت، توانائی اور گزرے عشروں میں آزادی کی جنگ میں بہنے والے خون کے ضیاع پر معافی مانگنی چاہیے۔ اُس کو فوری طور پر نئی صف بندی کرنی چاہیے، تنظیم آزادیٔ فلسطین (پی۔ ایل۔ او) کے تمام اداروں کو فعال کر دینا چاہیے اور معدوم ہوتے مستقبل کے لیے ایک نئی حکمتِ عملی وضع کرنی چاہیے۔" (رمزی بارود: فلسطینی قیادت، عوام اور ٹرمپ کا اعلان 'روزنامہ انقلاب' ۲۳/دسمبر ۲۰۱۷ء)

ملک کی مضبوط یہودی لابی کی وجہ سے یروشلم کو اسرائیل کی راجدھانی تسلیم کرنے اور امریکی سفارت خانہ یروشلم میں بننے کے اعلانِ ٹرمپ کو لے کر فلسطین کے تعلق سے ایک بار پھر عالمی برادری متحد ہوگئی ہے؛ لیکن جناب صبغۃ اللہ ندوی لکھتے ہیں کہ:

''یہ بھی ضروری نہیں کہ جنرل اسمبلی اور سلامتی کونسل میں امریکی پالیسی کے خلاف کوئی قرارداد منظور ہو اور امریکہ اُس پر عمل کرے۔ دنیا نے دیکھا کہ عراق جنگ کے خلاف سلامتی کونسل نے قرارداد منظور کی تھی، پھر بھی امریکہ نے غلط بنیادوں پر اُس پر حملہ کیا اور دنیا کچھ نہیں کرسکی۔... ۱۹۳ رکنی جنرل اسمبلی میں امریکی فیصلے کے خلاف قرارداد کے حق میں ۱۲۸، اور مخالفت میں نو ووٹ پڑے۔... اِسے امریکہ اور اسرائیل کی ہار اور فلسطینی اپنی جیت کہہ سکتے ہیں؛ لیکن حقیقت میں یہ صرف امریکہ اور اسرائیل کی ہار ہے، فلسطین کی جیت نہیں۔ کیوں کہ عالمی سطح پر اسرائیل کی حمایت نہیں بڑھ رہی ہے، تو فلسطینیوں کی حمایت بھی کم ہو رہی ہے۔ اس سے قبل جنرل اسمبلی میں فلسطین کو نان اسٹیٹ ممبر کا درجہ دینے والی قرارداد کے حق میں ۱۵۰ ووٹ پڑے تھے اور اس بار ۱۲۸ یعنی حمایت میں کمی آئی۔ اس کے علاوہ ہر دن فلسطینی اپنے حقوق اور اراضی سے کچھ نہ کچھ محروم ہو رہے ہیں۔ مشرقی یروشلم جسے فلسطینی اپنی ریاست کی راجدھانی بنانا چاہتے ہیں، اس کا نقشہ بدل گیا، آبادی کا توازن بگڑ گیا، اب مغربی کنارے کا نقشہ بدل رہا ہے۔ ہر جگہ یہودی آبادی اور یہودی بستیاں بڑھ رہی ہیں اور فلسطینی آبادی محدود ہو رہی ہے۔ یہودی لابی کبھی برطانیہ سے اعلان بالفور کا صد سالہ جشن منوا رہی ہے، تو کبھی امریکہ سے اپنے حق میں فیصلے کرا رہی ہے؛ لیکن فلسطینیوں کی پشت پر کھڑا عالم اسلام فلسطینیوں کے لیے کچھ نہیں کر پا رہا ہے۔ اب تو ایسی رپورٹیں آ رہی ہیں کہ امریکہ کے فریب میں آ کر مسلم ممالک اندرون خانہ فلسطینیوں کے خلاف اور اسرائیل کے قریب ہو رہے ہیں۔ کاغذ پر ضرور فلسطینی ریاست ہے اور اسے دنیا کے ۱۳۰ سے زیادہ ممالک اور سلامتی کونسل کو چھوڑ کر اقوام متحدہ کے مختلف ادارے تسلیم کر چکے ہیں لیکن زمین پر اس کو قائم کرنا اب بھی دور کی کوڑی ہے۔ جس دو ریاستی حل کی بات کبھی کی جاتی تھی، اب کوئی نہیں کرتا۔ دنیا ضرور بات چیت اور مذاکرات کے ذریعہ اسرائیل اور فلسطین کا مسئلہ حل کرنے کی بات کرتی ہے؛ لیکن مذاکرات اور بات چیت نہیں کراتی۔ جب اسرائیل گریٹر ہو رہا ہے اور فلسطین محدود تو صرف اقوام متحدہ کی قراردادیں کب تک فلسطین اور فلسطینیوں کا بچاؤ کریں گی، یہ غور طلب امر ہے۔

(صبغۃ اللہ ندوی: یروشلم پر امریکی شکست سے منزل قریب نہیں ہوئی/ روزنامہ خبریں/ ۳ جنوری ۲۰۱۸ء)

ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات:

مذکورہ بالا تمام جائزوں کے بعد ایک بھولا بھالا مومن ایک سیدھا سادا سوال یہ کر لیتا ہے کہ:

’’آخر مسلمانوں کی اس صورتِ حال کے لیے ذمہ دار کون ہے؟ کون مسلم ممالک کو تباہ و برباد کر رہا ہے؟ اس کا جواب ہر کوئی آسان کے ساتھ یہ دے گا کہ امریکہ اور یورپ ذمہ دار ہے، مسلمان صلیبی اور صیہونی سازش کے شکار ہیں، اسلام دشمن طاقتیں مسلمانوں کو مٹانے کے درپے لگی ہیں۔ جواب درست ہے، یہ بات مسلم ہے اور اس میں نیاپن کچھ بھی نہیں ہے۔ اسلام کے خلاف روزِ اول سے صلیبی، صیہونی سازش جاری ہے۔ ہر دور میں مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی کوشش کی گئی ہے، لیکن انہیں سازشوں کا مقابلہ کرتے ہوئے دشمنوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اسلام کا دائرہ مدینہ منورہ کی سرحد سے نکل کر پوری دنیا میں پہونچا ہے..... آج اگر ہم مغلوب ہیں، ہم پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں، آلام و مصائب اور دردناک مظالم کے دور سے گزر رہے ہیں، ان کی سازشوں کے شکار ہو رہے ہیں، ان کا مقابلہ نہیں کر پا رہے ہیں، ہماری قوت دفاع ہیچ ثابت ہو رہی ہے، تو اس کے لیے ذمہ دار ہم خود ہیں کوئی اور نہیں۔ مشرق وسطیٰ کی تباہی و بربادی، مسلم ممالک میں جاری انتشار و خلفشار اور دنیا بھر میں مسلمانوں کی ذلت و رسوائی ہماری بداعمالی، ناقص سیاسی حکمت عملی، دفاعی کمزوری، آلات جنگ سے محرومی، قرآنی تعلیمات اور شرعی اصول سے انحراف کے سبب ہے۔‘‘

(شمس تبریز قاسمی: روزنامہ خبریں ۲۵/اگست ۲۰۱۶)

اور درحقیقت یہی ہمارا ضعف ہے۔ اب اگر یروشلم ہاتھ سے نکلتا ہوا نظر آ رہا ہے تو اس میں بھی قصور اپنا ہی ہے، بقول ڈاکٹر اقبال

ع ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

میر کیا سادہ ہیں کہ بیمار ہوئے جس کے سبب...

ایک طرف غیروں کی عیاریاں ہیں، تو دوسری طرف اپنوں کی سادگی کا عالم یہ ہے کہ مغرب کے سکھائے ہوئے سبق کے مطابق صدرِ اسلام یعنی خالص اسلامی ملک سے اعلان کیا جاتا ہے کہ: ’’اب ہم... ایسے اسلام کی طرف جا رہے ہیں جو معتدل ہے اور جس میں دنیا اور دیگر مذاہب کے لیے جگہ ہے۔‘‘ پھر یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ ’’ملکی معیشت کا انحصار تیل پر کم کر کے سیاحت اور تفریحی سرگرمیوں کو فروغ دیا جائے۔‘‘

اعلان کیا جاتا ہے کہ ''اب ملک میں جاز فیسٹول منعقد کیے جائیں گے جن میں غیر ملکی موسیقار اپنے فن کا اظہار کریں گے۔'' اسلامی تہذیب کی حفاظت وحمیت نہیں، بل کہ ''دوسری تہذیبوں کے ساتھ ہم آہنگی کو فروغ دینا ہے۔'' ٹرمپ کے امن عالم کا قائد ہونے کا اور رسول السلام ہونے کا اعلان دار الامن کے مرکز بقعۂ مبارکہ حرم محترم سے کیا جا رہا ہے۔ اور صورتِ حال بایں نوبت رسید کہ سعودی عرب کے اسکولوں کالجوں میں نصاب امریکی ماہرین کی نگرانی میں مرتب ہو رہا ہے جس میں قرآن وحدیث کے وہ حصے شامل نہیں کیے جائیں گے جو جہاد پر مشتمل ہیں یا جن سے بقول اُن کے انتہا پسندی کو فروغ ملتا ہے۔ اسلام کو جدید شکل میں پیش کرنے کے لیے احادیث رسول ﷺ کی از سر نو تدوین کی جائے گی جس میں تشدد اور انتہا پسندی پر مشتمل احادیث کو کتابوں سے نکالا جائے گا، صرف امن ویکجہتی جیسی حدیثیں باقی رکھی جائیں گی۔

(روزنامہ خبریں ۸/نومبر ۲۰۱۷ء چوں کفر از کعبہ برخیزد از جناب ندیم الواجدی)

''مستشرقین کے اعتراضات کا جواب دینے اور دفاع کرنے کے بجائے خود اسلامی تعلیمات کو بدل کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا ہے۔۔۔۔۔۔ عالم اسلام کی تاریخ کا یہ پہلا موقع ہے جب کسی حکومت نے مغرب کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہوئے یہ تسلیم کرلیا ہے کہ اسلام انتہا پسندی پر مبنی ہے، محمد عربی ﷺ کا لایا ہوا نظام فرسودہ ہوچکا ہے، حکومت وریاست کی ترقی میں اسلامی تعلیمات رکاوٹ بن رہی ہیں۔''

(شمس تبریز قاسمی: روزنامہ خبریں سعودی معاشرہ میں تبدیلی کا رجحان ۲/نومبر ۲۰۱۷ء)

مسلم ممالک نے اپنے ملکوں میں آئین اسلام ہی کو منسوخ کر ڈالا ہے (اور اس کی جگہ) آئین مغرب کو نافذ کر رکھا ہے ...بیسویں صدی میں) مصر، شام، لبنان، عراق، الجزائر سب جگہ یہی ہوا... اب (نام نہاد) ''معتدل اسلام'' کے پردہ میں (اسی مغربی تہذیب وثقافت کو درآمد کر رہے ہیں۔)

(ماخوذ از روزنامہ ''خبریں'' کیا یہ ممکن ہے؟ از عالم نقوی ۱۰/جنوری ۲۰۱۸ء)

عالم اسلام میں اہلِ اسلام کی اِسی بدفہمی کی طرف اشارہ ایک شاعر اپنی روزمرہ کی زبان میں کر گیا ہے کہ:

میر کیا سادہ ہیں کہ بیمار ہوئے جس کے سبب   اُسی عطار کے بیٹے سے دوا لیتے ہیں

ایک وقت تھا جب مسلمان مسلمان تھے،تو خود عیسائی سلاطین و نصاریٰ اپنے معاملات اور باہمی محاربات کا تصفیہ کرانے کے لیے مسلمان سلطان امیر المومنین سے درخواست کرتے اور اپنی نیاز مندی کا ثبوت پیش کرنے لیے کوشاں رہا کرتے تھے، پھر جب انھیں رضا اور حمایت کا پروانہ سلطان المسلمین کی طرف سے فراہم ہو جاتا،تو نہایت ادب کے ساتھ زمین کو بوسہ دیتے اور دست بستہ سراپا اظہار تشکر بن کر سر جھکائے کھڑے رہا کرتے۔

(دیکھیے: خلافتِ اندلس ص ۲۲۰-۲۲۷، از نواب ذوالقدر جنگ بہادر)

لیکن اب صورتِ حال معکوس ہو چکی ہے۔اگر مسلمان اس امر کا ادراک کر لیں کہ اُن کی اصل قوت ایمان اور عمل صالح اور اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی فکر میں ہے،تو انہیں یہ معلوم ہو جائے گا کہ ”بے وقعتی، ذلت و رسوائی، قتل و غارت گری، مسلم ممالک میں جاری بدامنی ہمارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے، ہمارے گناہوں کی سزا ہے۔ہم نے قرآن کے اصولوں کو نہیں اپنایا ہے، محسن انسانیت ﷺ کے نقش قدم پر ہم عمل پیرا نہیں ہیں، حضراتِ صحابہ کرام کو ہم نے اپنا آئیڈیل نہیں بنایا ہے، خلفاء راشدین کی سیاست کو ہم نے نمونہ تسلیم نہیں کیا ہے، اسلام کو ہم نے اپنا ضابطہ حیات نہیں بنایا ہے، شریعت کے آئین سے ہم روگردانی کر رہے ہیں، اس لیے تباہی، بربادی اور قتل و غارت گری ہماری مقدر بنی ہوئی ہے۔“

(شمس تبریز قاسمی: روزنامہ خبریں ۲۵/ اگست ۲۰۱۲)

مرض کا علاج ازالہ سبب کے ذریعہ ہوا کرتا ہے۔مذکورہ صورتِ حال میں مرض کی ماہیت المرضی کیفیات ذکر کی گئیں، اُن کا حل اور تدارک بھی تدبیر کے درجے میں عرض کیا جا چکا۔خود احتسابی کے درجے میں بسوائے اِس کے اور کچھ نہیں ہے کہ انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی اپنے عقائد، خیالات، افکار و اعمال، تہذیب اور تمدن کو اسلامی تعلیم کے مطابق بنائیں اور خود اپنے لیے بھی اور قوم مسلم کے لیے بھی محبوب کبریاء کے وسیلے کے ساتھ خدا سے رو رو کر دعاء کریں کہ:

خار ہیں، بدکار ہیں، ڈوبے ہوئے ذلت میں ہیں ☆ کچھ بھی ہیں، لیکن ترے محبوب کی امت میں ہیں

خلق کے راندے ہوئے دنیا کے ٹھکرائے ہوئے ☆ آئے ہیں اب تیرے در پر ہاتھ پھیلائے ہوئے

اے دعاء، ہاں عرض کر عرشِ الٰہی تھام کے ☆ اے خدا رخ پھیر دے، اب گردشِ ایام کے

قبلۂ اول کا محافظ اور مستحق کون؟

مولانا محمد مرشد صاحب قاسمی/ استاذ جامعہ اکل کوا

﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا، اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ (بنی اسرائیل)

ترجمہ: پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندۂ خاص کو رات کے ایک قلیل حصے میں مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ لے گیا؛ جس کے اردگرد ہم نے برکت دی تا کہ ہم ان کو اپنی نشانیاں دکھائیں، بلاشبہ وہ خوب سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

ایک بابرکت جگہ:

بیت المقدس اور اس کے اردگرد اللہ تعالیٰ نے ظاہری اور معنوی بے شمار برکتیں رکھی ہیں۔ ظاہری برکت تو یہ ہے کہ اس کے اردگرد قسم قسم کے پھل، کھیتیاں اور نہریں ہیں۔ اور معنوی برکت یہ ہے کہ اس کے اردگرد بہت سے صالحین اور حضراتِ انبیائے کرام مدفون ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سب سے زیادہ انبیائے کرام اس علاقے میں مبعوث ہوئے، اس کے بابرکت ہونے کا تذکرہ متعدد آیتوں میں ہے۔

حضرت لوط اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کی نجات کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ﴿وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ﴾ (الانبیاء) ہم نے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ کو نجات دے کر اس سرزمین میں پہنچایا جس میں ہم نے دنیا والوں کے لیے برکت رکھی۔

حضرت سلیمانؑ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖٓ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا﴾ (الانبیاء)

ہم نے حضرت سلیمانؑ کے لیے تیز ہوا کو مسخر کر دیا جو اُن کو اس سرزمین کی طرف لے جاتی جس میں ہم نے برکت دی۔

قومِ سبا کی خوش حالی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا: ﴿وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً﴾ (سبا) ہم نے ان کے اور ان کی بستیوں کے درمیان جس میں ہم نے برکت دی، راستہ پر سے نظر آنے والی بستیاں بنائیں۔

ایک مقدس جگہ:

اس سرزمین کو اللہ تعالیٰ نے ارضِ مقدسہ سے تعبیر کیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کا قول نقل کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ﴿يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ (المائدۃ)

اے میری قوم! مقدس سرزمین میں داخل ہوجاؤ، جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے مقدر کردیا ہے۔

وہ رفعت اور بلندی والی سرسبز و شاداب جگہ ہے:

اللہ تعالیٰ نے اس مقام کو بلندی اور شادابی نصیب فرمائی۔ قرآن کریم حضرت عیسیٰؑ اور ان کی والدہ حضرت مریم کا یوں تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے: ﴿وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗۤ اٰيَةً وَّاٰوَيْنٰهُمَاۤ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ﴾ (المومنون)

ہم نے حضرت عیسیٰؑ اور ان کی والدہ کو قدرت کی ایک نشانی بنایا اور دونوں کو ایک بلند قرار اور چشمہ والی جگہ پر ٹھکانہ دیا۔

ہمارے نبی ﷺ کی جائے اسراء ہے:

ہمارے نبی خاتم النبیین ﷺ کے سفرِ اسرا کی انتہا اسی ارضِ مقدس پر ہوئی۔ واضح ہو کہ سفرِ معراج کے دو حصے ہیں۔ ایک زمینی جو مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک اس کو اسراء کہا جاتا ہے اور دوسرا مسجدِ اقصیٰ سے عالمِ بالا کی طرف اس کو معراج کہا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس بابرکت جگہ کا انتخاب کیا تاکہ وہاں کی معنوی برکتیں آپ کو حاصل ہوں اور تمام انبیائے کرام کی خوبیاں اور کمالات آپ کے اندر منتقل ہوجائیں، چناں چہ اللہ تعالیٰ نے تمام خوبیاں آپ ﷺ کے اندر منتقل کردیں۔

ایک شاعر کہتا ہے:

حسنِ یوسف دمِ عیسیٰ ید بیضا داری   آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

اس بابرکت جگہ پر سفرِ اسرا میں لے جانے کا ایک بڑا مقصد یہ بھی تھا کہ دنیا والوں پر یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح اور صاف ہوجائے کہ یہ مقدس جگہ اگر آخری نبی کی جائے اسرا ہے، تو اس جگہ کا وارث بھی ان کی آخری امت ہی ہوگی، کوئی دوسری امت صبحِ قیامت تک اس کی وارث نہیں ہوسکتی۔

بیت المقدس ہمارے پیغمبر ﷺ کے امامت کی جگہ ہے:

آپ ﷺ جہاں سید الاولین والآخرین اور محبوب رب العالمین خاتم النبیین ہیں، وہیں آپ امام النبیین بھی ہیں۔ شب اسرا میں آپ ﷺ کا ایک بڑا معجزہ یہ ظاہر ہوا کہ اس رات میں آپ ﷺ کے لیے سارے انبیائے کرام کو زندہ کر دیا گیا اور اس شب میں آپ ﷺ نے مسجد اقصیٰ میں سارے انبیا کی امامت بھی فرمائی اور اسی وقت یہ آیت بھی نازل ہوئی: ﴿وَسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رُّسُلِنَا اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ آلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ﴾ (الزخرف)

نبی ﷺ سے پہلے انبیائے کرام سے پوچھ لیں کیا ہم نے رحمٰن کے سوا کچھ معبود بنائے جن کی پرستش کی جائے؟

وہ ہمارا قبلۂ اول ہے:

ہمارے نبی ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لائے تو وہاں اس وقت یہودیوں کے تین بڑے قبائل آباد تھے۔ بنو قریظہ، بنو نضیر اور بنو قینقاع، تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ ﷺ نے سولہ یا سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی، تا کہ یہودیوں کو اسلام اور مسلمانوں سے قرب ہو۔ اور وہ اپنا پرانا تعصب وعداوت ختم کر کے آپ ﷺ کی رسالت ونبوت کو تسلیم کر لیں، لیکن خاطر خواہ فائدہ اور تبدیلی ان کی زندگی میں نظر نہ آئی۔ دوسری طرف آپ ﷺ کی دلی خواہش تھی کہ بیت اللہ کو قبلہ بنا دیا جائے اور بار بار آپ آسمانوں کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتے تھے کہ کب وحی آئے اور تحویلِ قبلہ ہو جائے؛ چناں چہ تحویلِ قبلہ کا حکم آ گیا اور بیت اللہ کو قبلہ قرار دیا گیا۔ **﴿قد نریٰ تقلب وجهک في السمآء فلنولينک قبلة ترضها فول وجهک شطر المسجد الحرام﴾** البقرة

ترجمہ: تحقیق کہ ہم آسمان کی طرف بار بار آپ کی نگاہ اٹھتے دیکھ رہے ہیں۔ ضرور ہم آپ کو ایسے قبلہ کی طرف پھیر دیں گے، جو آپ پسند فرماتے ہیں۔ سو آپ مسجد حرام کی طرف رخ کر لیں۔

آگے اللہ تعالیٰ نے تحویلِ قبلہ کا ایک مقصد بھی بتا دیا: ﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ﴾ (البقرة) آپ جس قبلہ پر تھے وہ ہم نے اس لیے رکھا تھا؛ تا کہ ہم دیکھ لیں کہ پھر جانے والوں میں سے کون رسول کی پیروی کرنے والے ہیں۔

حشر کے لیے ندا وہیں سے ہوگی:

حضرت اسرافیلؑ پہلی مرتبہ صور پھونکیں گے تو سارے انسان مرجائیں گے۔ پھر دوسری مرتبہ صور پھونکیں گے تو سب زندہ ہوجائیں گے اور دونوں صوروں کے درمیان ۴۰ سال کا فاصلہ ہوگا۔ اور جب سارے انسان زندہ ہوں گے؛ تو میدانِ حشر میں جمع کرنے کے لیے وہیں سے ندا ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَكَانٍ قَرِيْبٍ﴾

ترجمہ: اے مخاطب سن! جس دن ایک پکارنے والا قریبی جگہ سے پکارے گا۔ قریبی جگہ سے مراد مفسرینؒ کے نزدیک صخرۂ بیت المقدس ہے، جو وسطِ ارض ہے اور زمین کا وہ حصہ آسمان سے زیادہ قریب ہے۔

ارضِ مقدس اور مسجدِ اقصیٰ کا مستحق اور محافظ کون؟

جب وہ ارضِ مقدس مہبطِ انبیا اور مدفنِ انبیا ہے تو ظاہر ہے، ایسی مقدس جگہ کے محافظ قاتل اور ظالم لوگ نہیں ہوسکتے۔ جس قوم نے عام انسانوں کو ہی نہیں؛ بل کہ کائنات کی عظیم ہستیوں، یعنی انبیائے کرام کو بھی قتل کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کے جرائم کو بار بار قرآنِ کریم میں ان الفاظ میں ذکر کیا ہے: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ﴾ (البقرۃ) ان پر یہ سب حالات اس لیے آئے کہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کا انکار کرتے اور حضراتِ انبیائے کرام کو قتل کرتے تھے۔

وہ جگہ نہایت بابرکت ومقدس ہے تو اس بابرکت جگہ کی مستحق وہ قوم ہرگز نہیں ہوسکتی، جن پر اللہ تعالیٰ نے ذلت ومسکنت کا ٹھپہ لگادیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ (آل عمران)

ترجمہ: ان پر ذلت ومسکنت کا ٹھپہ لگادیا گیا اور وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے غضب کو لے کر لوٹے۔

اس عظیم عبادت گاہ کے مستحق عبادت واطاعت سے روگردانی کرنے والی قوم نہیں ہوسکتی۔ اس قبلۂ اول کے محافظ وہ یہود ونصاریٰ نہیں ہوسکتے، جنہوں نے ہمیشہ نمازیوں اور قبلوں کی بے حرمتی کی۔ اس حشر کی جگہ کے محافظ حشر اور یومِ آخرت کے منکر نہیں ہوسکتے۔

ارضِ مقدس اور مسجدِ اقصیٰ کے محافظ صرف مسلمان اور اہلِ ایمان ہی ہوسکتے ہیں؛ لیکن آج امریکہ اسلام دشمنی اور اہلِ اسلام سے نفرت کی بنیاد پر ایسے فیصلے کررہا ہے اور مسلمانوں کے جذبات کو مشتعل کررہا ہے۔ افسوس ہے عرب حکمرانوں پر جو اس عظیم عبادت گاہ کی فکر نہیں کررہے ہیں، قبلۂ اول کی بازیابی کی کوشش نہیں کررہے ہیں۔ کاش اللہ تعالیٰ آج ہمارے درمیان کوئی عمر فاروق ثانیؓ اور صلاح الدین ایوبیؒ کو پیدا کردے۔ عرب حکمرانوں کی فکروں میں اتحاد پیدا کرکے ان کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کردے اور قبلۂ اول کی بازیابی کی شکلیں پیدا فرمادے۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز.

آندھیوں کے زد پہ ایک جلتا ہوا دیا

''مسجدِ اقصیٰ''

بقلم: مولانا افتخار احمد صاحب قاسمی بستوی/ استاذ جامعہ اکل کوا

اللہ نے جس مسجد کو''مسجدِ اقصیٰ'' کہہ کر قرآن پاک کے پندرہویں پارے میں معراج نبوی سے متعلق گفتگو فرماتے ہوئے "الذي بٰرکنا حوله" (۱۵/ اسراء) کی عظیم الشان روحانی وجسمانی، ظاہری وباطنی اور لفظی ومعنوی خصوصیات وامتیازات سے آراستہ وپیراستہ فرمایا ہے، وہ مسجد اسی ''القدس'' شہر میں آباد ہے، جس کو ابھی ابھی حالیہ دنوں میں امریکہ کے موجودہ صدر ڈونالڈ ٹرمپ نے یہودیوں کے ناجائز ملک اسرائیل کی راجدھانی بنانے کا فیصلہ سنایا تھا۔ یہ بات جگ ظاہر ہے کہ القدس وہی مقام مقدس ہے، جہاں ان آبلہ پا مسلمانانِ عالم کا قبلہ اول آباد ہے، جو مسجدِ اقصیٰ کے نام سے معروف ومشہور ہے۔ جس کی حفاظت اہلِ اسلام نے ماضی میں بھی اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے کی ہے اور آئندہ بھی اس جاں گسل قوم کی رگ حمیت پھڑکتے ہی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے میں دیر نہیں کرے گی۔

مسجدِ اقصیٰ، القدس اور فلسطین دنیا کے وہ خطے ہیں؛ جنھوں نے اپنی نظروں سے ایسے ایسے جیالے دیکھے ہیں جنھوں نے ہزار ہا بادِ مخالف میں بھی اپنی تمناؤں کے دیپ جلائے رکھے اور دشت حفاظت میں آبلہ پائی سے گزرتے رہے لیکن آندھیوں میں اپنا دیا بجھنے نہ دیا۔

آبلہ پا کوئی اس دشت میں آیا ہوگا ورنہ آندھی میں دیا کس نے جلایا ہوگا

مسجدِ اقصیٰ کے اردگرد سے اہل تفسیر محققین نے ملک شام مراد لیا ہے۔ جس کی ظاہری ومحسوس برکات مختلف النوع اشجار ونباتات اور نوع بہ نوع پھل فروٹ کے پودوں کا اُگنا ہے۔ نہروں، تالابوں اور پانی کے اسٹاک سے ہرے بھرے باغات کا سیراب ہو کر بنی نوع انسان کو لحہ بہ لحہ اور وقتِ ضرورت فائدہ رساں ہونا ہے۔ اور باطنی وروحانی برکات سے مراد بے شمار انبیائے کرام کا مسجدِ اقصیٰ کے اردگرد ملک شام میں مدفون ہونا ہے۔ یہی مسجدِ اقصیٰ اکثر انبیا علیہم السلام کا قبلہ رہی ہے، جس میں روح کا تلبس روحانی برکات میں اضافے کا باعث ہے۔ اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسدِ اطہر سے متلبس جگہ عرش اعظم سے زیادہ فضیلت والی ہونا اس کو ایک جزئی فضیلت سے وابستہ کرنا زیادہ مناسب ہے۔

یہی وہ مسجدِ اقصیٰ ہے، جہاں رسولوں کے سردار، فرشتوں کے آقا، نبیوں کے نبی اور وجہِ تخلیقِ کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے سارے انبیا ورسل کی امامت کی عظیم الشان سعادت حاصل فرمائی تھی۔ مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک کا سفر "اسراء" کہلاتا ہے، جس کا انکار ہر حال میں کفر کی خندق میں لامحالہ ڈھکیل دیتا ہے۔

ایک وقت آیا کہ بابل کے بادشاہ بخت نصر نے بے شمار لشکر کے ساتھ اس شہر پر دھاوا بول دیا۔ آخرش شہر کو تاخت وتاراج کر کے اپنے ساتھ قیدیوں کی ایک بڑی تعداد پکڑ لے گیا۔ دولت وثروت کے خزانوں کو لوٹ لیا، پھر پہلے بادشاہ کے خاندان کے ایک شخص کو اپنی نیابت میں مسئول بنا کر چلا گیا۔

حالات نے انگڑائی لی، شب وروز نے اٹکھیلیاں کھیلیں، موجودہ بادشاہ کے نائب نے ہوا میں قلعے بنانے اور بادشاہ کے خلاف دوادوش اور ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔ ننانوے کے پھیر میں آ کر اپنی بت پرستی، بدکاری اور ظلم وستم کی کارستانیوں میں اضافہ کر دیا، آخر کار بخت نصر سے بغاوت کی۔ اس وقت کے نبی حضرت ارمیا علیہ السلام نے اپنی سی کوشش پند ونصائح میں صرف کر دی، لیکن سب رائگاں چلی گئی۔ اس نے ایک کی بھی نہ سنی، بخت نصر پھر چڑھ آیا، اب اس قدر کشت وخون کیا، قتل وغارت گری اور فتنہ وفساد برپا کیا جس کی حد نہیں۔ پورے شہر کو نذرِ آتش کر دیا، مسجدِ اقصیٰ میں بھی آگ لگا دی، اس کو مسمار کر کے بالکل زمین کے برابر کر دیا، مسجدِ اقصیٰ کی تعمیر کے تقریباً ۱۵رسو سال بعد یہ عظیم اور جان کاہ حادثہ پیش آیا تھا۔

آگے چل کر شاہ ایران کے ہاتھوں شاہِ بابل کا قلع قمع اور استیصال ہوا۔ شاہِ ایران رحم دلی کا معاملہ کر کے یہودیوں کو ان کے ملک شام میں پہنچا دیا۔ پھر یہودیوں نے ایران کے بادشاہوں کے تعاون ومساعدت سے قدیم نمونے کے مطابق مسجد کو از سرِ نو تعمیر کروایا، شہر پناہ اور فصیل وغیرہ کو از سرِ نو تعمیر کیا، یہاں آ کر اپنے گندے اعمال اور برے افعال پر بھی قدرے ندامت ان کو ہوئی تھی۔

"مگر اس کے بعد پھر وہی پرانی شرارتیں سوجھیں، تو ایسے اسباب جمع ہوئے کہ ایک بادشاہ جس نے انطا کیہ آباد کیا ہے کہ بیت المقدس پر حضرت مسیح علیہ السلام سے ۱۷۰ر برس پہلے چڑھ آیا۔ چالیس ہزار یہود کو قید، چالیس ہزار کو قتل کیا اور مسجد کی بڑی بے عزتی کی، مگر مسجد بچی رہی۔ پھر اس بادشاہ کے جانشینوں میں ایک بادشاہ نے شہر اور مسجد کو ویران کر دیا، پھر بعد میں چند سلاطین روم کی اس جگہ حکومت ہوگئی تو انہوں نے مسجد کو درست کیا اور اس کے آٹھ سال بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے"۔

''پھر یہود نے سلاطین روم سے بغاوت اختیار کی۔ آخر رومیوں نے پھر شہر اور مسجد کی وہی حالت بنائی، اس وقت کے بادشاہ رومی کا نام ''طیطس'' تھا، جو نہ یہودی تھا نہ نصرانی۔ کیوں کہ اس کے بہت روز بعد قسطنطین اول عیسائی ہوا ہے، یہ حادثہ عیسیٰ علیہ السلام کے صعود سے چالیس برس بعد ہوا اور اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے تک یہ مسجد ویران پڑی رہی، حتی کہ آپ نے تعمیر کرائی۔ یہ ہے اجمالی حکایت ان واقعات کی''

(بیان القرآن: ۱/۷۵)

حالاتِ حاضرہ میں آج اسرائیل کی ریشہ دوانیوں کی داستان ہر روز ایک نئی کروٹ لیتی اور نئے رخ پر رواں دواں نظر آتی ہے۔ مسجد اقصیٰ تو اہلِ ایمان کے دین وایمان کا ایک اٹوٹ حصہ ہے، انہوں نے تو تاریخ کی روشنی میں مسجدِ اقصیٰ کے ساتھ ہمیشہ بے حرمتی کا ہی معاملہ کیا ہے اور آج القدس پر قبضہ کرنے کی بڑی فکر ہے۔

تجھے کیوں فکر ہے اے گل! دل صد چاک بلبل کی　　تو اپنے پیرہن کی چاک تو پہلے رفو کرلے

ہے لازوال عہد خزاں اس کے واسطے　　کچھ واسطہ نہیں ہے اسے برگ وبار سے

ہے تیرے گلستاں میں بھی فصل خزاں کا دور　　خالی ہے جیب گل زرِ کامل عیار سے

القدس کو اسرائیل کی راجدھانی کے لیے طے کرنے کا فیصلہ عالمی برادری نے اپنی مجموعی طاقت سے پوری طرح غلط ثابت کر دیا اور امریکہ کو اپنے ''نام نہاد اعتدال پسندانہ'' فیصلے سے پیچھے ہٹنا پڑا۔ اسرائیل کو بالخصوص؛ اور مغرب پرست اسلام مخالف طاقتوں کو بالعموم یہ مان لینا چاہیے کہ۔

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے　　اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبائیں گے

اسلام کی صاف شبیہ کو خراب بتانے کی سعیِ مسلسل، مسلمانوں کو دہشت گردی اور ظلم سے جوڑنے کی مذموم کوشش، ہر موڑ پر اہلِ اسلام ہی کو موردِ الزام ٹھہرانے کی ناپاک تگ وتاز اور خود کو پوری دنیا پر غالب وصاحبِ اقتدار بنانے کی دوادوش، بحکم خداوندی کبھی بھی عملی جامہ پہننے والی نہیں ہے۔ اس لیے کہ اسلام کے بارے میں اعلانِ خداوندی ہے کہ اسے دنیا کے تمام ادیان پر غلبہ مل کر رہے گا۔

اسرائیل اپنے ظلم وستم کے شکنجوں سے فتح یابی کے راستے ہرگز ہموار نہیں کرسکتا۔ اسے یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ کانٹے بونے سے پھل دار نتیجے مرتب نہیں ہوتے، متعفن اور بدبودار شجر لگانے سے خوش بودار اور لذیذ پھل کی تمنا عبث ہے۔

زہر بو کے شیریں ثمر کی توقع — نہ جانے کہاں کی یہ دانش وری ہے

سنا تم نے دنیا میں اے لعل و گوہر — مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے؟

موجودہ اسرائیل نے فلسطین کے لیے مقررہ ۶۰ رفیصد رقبے پر ناحق تسلط جما کر سات لاکھ سے بھی زیادہ پرامن مقامی فلسطینیوں کو اپنے آبائی گھروں سے جلاوطن کر رکھا ہے۔ مزید برآں اس نے گذشتہ پچاس سالوں میں مسجدِ اقصیٰ کی اینٹ سے اینٹ بجانے اور اسے نیست و نابود کرنے کی کوئی بھی سازش ہاتھ سے نہ جانے دی، اسی اسرائیل نے موقع پا کر پُرامن نمازیوں پر مسجد اقصیٰ کے ائمہ کرام کی نہ صرف یہ کہ بے حرمتی کی؛ بل کہ انہیں زدوکوب بھی کیا، جان سے مار ڈالنے کی دھمکی دی اور جان لیوا حملے بھی کیے۔

اسرائیل کی ناعاقبت اندیش فوج ظلم و ستم کی ہر شکل کو روا رکھتے ہوئے مسجد اقصیٰ کے اندر جوتوں سمیت گھس آئی۔ قرآن کریم کے اجزا اور پاروں کی بے حرمتی کی، منبر و محراب کی توہین کی، اپنے ناپاک قدموں سے روند کر ان کا تقدس پامال کیا، اسی ظالم و جابر حکومت کے لیے امریکہ القدس کو دارالسلطنت بنانا چاہتا ہے، اس ظلم کو دنیا دیکھ رہی ہے کہ یہ ظلم بالکل عیاں ہے۔ ع عیاں را چہ بیاں

ظلم کا نتیجہ بہر حال برا ہے۔ ہر ظالم نے اپنے کالے کرتوتوں کا خمیازہ اسی دنیا میں بھگتا ہے، جس نے بھی ان کی طرف داری کی ہے اس کو بھی ڈبو دیا ہے۔

ظلم کی ٹہنی کبھی پھلتی نہیں — ناؤ کاغذ کی کبھی چلتی نہیں

۱۹ر دسمبر ۲۰۱۷ء کو جب امریکہ نے نہایت بے شرمی سے پوری دنیا کی بالعموم اور مسلمانانِ عالم کی بالخصوص مخالفتوں کی ذرہ برابر پرواہ کیے بغیر سلامتی کونسل میں فیصلہ واپس لینے کی تجویز کو ویٹو VETO کر دیا۔ حالاں کہ وہ ممالک جو اسرائیل کو آباد کرنے میں امریکہ کے شانہ بہ شانہ چلے تھے، جیسے کہ فرانس اور انگلینڈ ان جیسے ملکوں نے بھی اس موقعے پر امریکہ کا ساتھ نہیں دیا اور یروشلم (القدس) کو اسرائیل کی راجدھانی قرار دیے جانے کی پُر زور مخالفت کا دم بھرا۔

ایسی ناگفتہ بہ صورتِ حال کے آئینے میں ہمیں مبہم دعووں سے آگے بڑھ کر کچھ ٹھوس اور دُور رس نتائج کے حامل اقدامات کا بیڑا اٹھانا چاہیے۔ سب سے پہلے تو یہی کہ اپنی گرج دار آواز کو حکومت کے ایوانوں تک اس طرح پہنچائیں کہ اہلِ اسلام کی سرفروشانہ تاریخ یاد آ جائے کیوں کہ۔

خاموش مزاجی تمہیں جینے نہیں دے گی — اس دور میں جینا ہے تو کہرام مچا دو

ذہنی آزادی، مذہبی رواداری، مساوات واعتدال، انفرادی آزادی اور اجتماعیت کے حوالے سے دنیا کو یہ باور کرادیں کہ القدس پر قبضہ اور اس کو اسرائیل کی راجدھانی کے لیے مخصوص کردینا، جہاں اہلِ ایمان کی انفرادی زندگی میں دخل اندازی ہے، وہیں ان کی ذہنی ومذہبی آزادی پر بھی کاری ضرب ہے۔ جو عالمی دستور وآئین کی دستاویزات کے بھی خلاف ہے، اگر آج دوسروں کو یہ پڑھنے کا حق ہے کہ ؎

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

تو ہمیں پڑھنا اور اس کا عملی اور منہ توڑ جواب دینا کیا اہلِ اسلام کا موروثی اور اخلاقی وایمانی حق نہیں؟!

۱۹۸۰ء میں یو، این، او (اقوامِ متحدہ) نے القدس کے تئیں ایک قرارداد منظور کی تھی، جس کا مضمون تھا کہ اسرائیل القدس سے اپنا ناجائز قبضہ فوراً ختم کرے۔ لیکن عملی طور پر اسرائیل نے اپنے ظالمانہ پنجے گڑائے رکھے اور یروشلم (القدس) پر اپنا قبضہ جاری رکھتے ہوئے اسی کو "اسرائیل" کا "دارالسلطنت" بھی قرار دیے جانے کے فیصلے کا پُر زور خیر مقدم کیا۔ ان سنگین حالات میں ہمیں عالمی برادری کو یہ قرارداد بہ بانگ دہل یاد دلانی چاہیے اور کچھ سرفروشانہ تمنائیں قلم وزبان کے راستے سے تجسیمی شکل اختیار کرنا چاہیے کہ ؎

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی روحِ امم کی حیات، کشمکشِ انقلاب

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

پردہ اٹھادوں اگر چہرۂ افکار سے لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

عالم نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب

اب موجودہ حالات اس بات کے شدید متقاضی ہیں کہ مسلمانانِ عالم غزہ کی ناکہ بندی فوراً ابلا تاخیر ختم کرانے اور ایک خود مختار آزاد فلسطینی ریاست کے قیام کے لیے عالمی برادری سے بالعموم اور اقوامِ متحدہ سے بالخصوص مثبت اور نتیجہ خیز مداخلت کا مطالبہ کریں۔ اور خود بھی منصوبہ بند طریقے پر عملی پیش رفت کریں اور اس بات پر بھی پورے وثوق کے ساتھ، اسلامی عقیدہ مضبوط کرتے ہوئے دھیان دیں کہ اسباب وتدابیر اور نتیجے سب اللہ رب العزت کے ہاتھ میں ہیں اس لیے اللہ سے مانگ کر رابطہ استوار کرنے میں کوتاہی کو ذرا بھی راہ نہ دیں کہ ؎

دل بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جب تک نہ تیری ضرب ہے کاری، نہ میری ضرب ہے کاری

’’قبلۂ اول‘‘ اور ہماری ذمے داریاں!!!

محمد ہلال الدین بن علیم الدین ابراہیمی (منیجر شاہراہِ علم)

عصر حاضر کے تاریخی صفحات ہمسلمانوں کے خون سے لالہ زار ہیں۔ روز بروز شعائرِ اسلام، کتاب اللہ، رسول اللہ اور بیت اللہ کی توہین کی جارہی ہے، غرض ہر سو مسلمانوں کو بے آبرو کیا جارہا ہے اور اسی پر بس نہیں؛ بل کہ وہ مقامات جو مسلمانوں کے آبرو کی پہچان اور ان کی آن و شان ہیں، انہیں پامال کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جاچکی ہے اور یہ سلسلہ تاہنوز رکنے کا نام نہیں لے رہا۔ کہیں مسلمانوں کے ایمان کی آزمائش ہے..... کہیں ان کے مردہ ضمیر کو جھنجھوڑنے کے اسباب..... کہیں بے غیرت ہونے کا احساس..... اور اسی بے غیرتی کے تھپیڑوں میں سے ایک توہین آمیز تھپیڑ بیت المقدس کا یہودیوں کے قبضہ میں چلا جانا ہے۔ نصف صدی سے زائد کا عرصہ گزر چکا، قبلۂ اول اُس ملعون قوم کے قبضہ میں ہے اور ہمیں اس کی بازیابی کی خاطر خواہ کوئی فکر نہیں، ایک طرف چند مسلمانانِ فلسطین ہیں اور دوسری طرف مسلمانوں کا موجودہ مسیحا سلطان طیب اردغان، اللہ اس مردِ مجاہد کی حفاظت فرمائے اور ان بے یار و مددگار فلسطینیوں کی غیب سے نصرت فرمائے، جو کنکی کے پتھروں سے اُن درندوں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے پتھروں کو ’’ابابیل کی کنکریاں‘‘ بنادے۔ آمین

ان حالات کو دیکھ کر کہیں اپنے ضمیر سے بھی شکایت ہے اور مسلمانوں کی اکثریت پر افسوس بھی..... ان فلسطینی معصوم شہیدوں کی لاشوں سے اٹھتے ہوئے سوالات شرم سے پانی پانی کردیتے ہیں، جب ان کے مقدس جنازے ہم سے مخاطب ہوکر یہ سوال کرتے ہیں: ’’اے مسلمانو! کیا قبلۂ اول صرف ہمارا ہے؟ کیا اس کی حفاظت صرف ہماری ذمے داری ہے؟ کیا ان یہودیوں کے توپوں کا مقابلہ کرنے کے لیے صرف ہمارے ہی سینے بنے ہیں؟ کیا اقصیٰ کی آبرو کی حفاظت کے لیے صرف ہماری ہی ماں بہنوں کی آبرو بھینٹ چڑھتی ہے؟‘‘ یہ ایسے سوالات ہیں، جو کہیں نہ کہیں ہمیں اپنے گریبان میں جھانکنے پر مجبور کر رہے ہیں اور ایمان و عقائد کو ٹٹولنے اور جائزہ لینے کی دعوت دے رہے ہیں۔

مسلمانو! مسلمان اسلام کی طرف بس منسوب ہونے کا نام نہیں:

مسلمان صرف اسلام کی طرف منسوب ہونے اور اسلامی نام رکھ لینے کا نام نہیں، بل کہ اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کا نام ہے، جسے ہم بچپن سے رٹتے آئے ہیں ’’ **امنت باللہ کما ھو باسمائہ وصفاتہ وقبلت جمیع احکامہ** ‘‘ لیکن ہم ہیں کہ ہمیں اس کے تقاضے کی ادائیگی کی کوئی فکر نہیں!!!۔

یہودیوں اور اسلام دشمن لابیوں کی زیرِ زمین سازشوں نے ہمارے ایمان کو پژمردہ کردیا ہے۔ ہماری اکثریت اسلام سے ناآشنا ہے، تعلیماتِ اسلام سے نابلد ہے، سنتِ نبوی وسیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے بے بہرہ ہے، احکاماتِ اسلام سے بے خبر و بے پروا ہے؛ کتنے ہی مسلمان قدس اور شہرِ قدس کی اسلامی حیثیت سے ناواقف ہیں، اس کی فضیلت سے غافل ہیں، اس سے متعلق پیشین گوئیوں سے انجان ہیں...... اور ایسا کیوں نہ ہو! اسلامی تعلیمات اور معاشرت سے مسلمانوں کی دوری ہی اس قدر ہوچکی ہے کہ میں بڑی ڈرنے کی بات نہایت مجبوری کے عالم میں لکھ رہا ہوں اور بہت ڈر کر لکھ رہا ہوں؛ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ''ہمارے بہت سے مسلمان خاص کر ''مغربیت زدہ'' اسلام کے بعض ضروری احکام، تہذیب اور معاشرے کو باعثِ عار سمجھتے ہیں، بعض عملاً اور بعض قولاً بھی، اللہ ہماری حفاظت فرمائے۔

حوصلہ افزا پیش رفت:

امریکی صدر ٹرمپ کی خفیہ سازشوں کے تحت، مقبوضہ بیت المقدس کو اسرائیلی دارالخلافہ بنانے کے اعلان کے بعد جہاں اسلامی حلقے میں ایک بھونچال رونما ہوا، جس سے بڑی خوشی ہوئی کہ اقصیٰ کے متعلق ابھی مسلمانوں کے خون میں حرارت باقی ہے۔ الحمدللہ۔ اسی وقت محبینِ اقصیٰ نے اپنی اپنی بساط کے مطابق کسی نے زبان سے، کسی نے قلم سے اور غیور حکمرانوں نے اپنی حکمرانی کی طاقت سے اس ابھرتے فتنے کو دبا دیا؛ لیکن مدِ مقابل اپنے ہدف میں بڑا احساس اور پرعزم ہے، اس لیے اب ہم جو جاگے ہیں؛ بس اسے غنیمت جانتے ہوئے جاگتے ہی چلے جائیں...... یہ ہر ایک مسلمان کی فکر ہونی چاہیے۔

اللہ جزائے خیر دے مدیرِ شاہراہِ علم کو؛ کہ وہ قدس کے مسئلے میں اسی وقت سے بہت حساس ہوگئے تھے۔ اور یہ تہیہ کرلیا تھا کہ شاہراہ کا خصوصی نمبر نکال کر امتِ مسلمہ کو قدس اور شہرِ قدس کے متعلق ضروری معلومات سے آشنا کروائیں گے اور اس کی بازیابی کی تجاویز بتا کر بازیابی کے لیے بیدار اور فکرمند کریں گے؛ اسی سلسلے کی یہ ایک کاوش ہے اللہ ہمیں قدس کے پاسبانوں میں شامل فرمائے۔

اس کی بازیابی کی صورت اور تجاویز تحریر کرنے سے پہلے، اس کی مختصر سی فضیلت واہمیت اور تاریخ پر روشنی ڈالنا ضروری ہے؛ کیوں کہ امتِ مسلمہ اس کی دینی حیثیت واہمیت سے بھی غافل ہے اور جب تک انہیں اس کی دینی حیثیت معلوم نہیں ہوگی، وہ اس کے لیے کوشاں کیوں کر ہوسکتے ہیں!!!

بیت المقدس کی فضیلت واہمیت:

بیت المقدس کی فضیلت کے لیے یہی کافی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآنِ کریم میں جا بجا اس کا ذکر کیا۔ اسے مقامِ برکت بیان کیا، جائے نجات قرار دیا، انبیا علیہم الصلوۃ والسلام کا مسکن، مہجر اور مدفن بنایا، اسے قرآن نے خود ارضِ مقدسہ کہا، اس میں دخول کو فلاح وبہبود گردانا، اور اس سے خروج وبیزاری کو خسران ونقصان کا پیش خیمہ قرار دیا۔ مسلمانوں کے عروج کا اسے ذریعہ بنایا، اپنی قربت کا اسے وسیلہ بنایا، خیرِ امت کا اسے عملی نمونہ بنایا، ہموم وغموم کے دفع کا زینہ بنایا، فتنۂ اکبر، وتعینِ اکبر سے حفاظت کا خیمہ اور اسلام کا قبلۂ اول بنایا۔

احقر مئی ۲۰۱۵ء کے شاہراہ میں فضائل بیت المقدس پر ''قبلۂ اول قرآن وحدیث کے آئینے میں'' اس عنوان سے روشنی ڈال چکا ہے؛ اس لیے یہاں صرف ایک دو حدیث کے ذکر پر ہی اکتفا کرے گا، نیز فضائل پر اس شمارے کے دیگر مضمون نگاروں نے تفصیلی قلم اٹھایا ہے، اس لیے مزید یہاں اس کی ضرورت نہیں۔

عَنْ مَيْمُونَةَ مَوْلَاةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَتْ: قُلْتُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ! أَفْتِنَا فِي بَيْتِ الْمَقْدِسِ، قَالَ: "أَرْضُ الْمَحْشَرِ وَالْمَنْشَرِ، ائْتُوهُ فَصَلُّوا فِيهِ فَإِنَّ صَلَاةً فِيهِ كَأَلْفِ صَلَاةٍ فِي غَيْرِهِ، قُلْتُ: أَرَأَيْتَ إِنْ لَمْ أَسْتَطِعْ أَنْ أَتَحَمَّلَ إِلَيْهِ، قَالَ: فَتُهْدِي لَهُ زَيْتًا يُسْرَجُ فِيهِ فَمَنْ فَعَلَ ذَلِكَ فَهُوَ كَمَنْ أَتَاهُ".

(سنن ابن ماجه ۱/ ۴۵۱، ۱۴۰۷)

حضرت میمونہ نے آپ ﷺ سے بیت المقدس کے متعلق حکم دریافت کیا، آپ ﷺ نے فرمایا: وہ ارضِ محشر ومنشر ہے۔ وہاں جاؤ اور اس میں نماز پڑھو، کیوں کہ اس میں نماز پڑھنا بہ نسبت دوسری مسجد میں نماز پڑھنے کے ایک ہزار گنا زیادہ ثواب رکھتا ہے۔

حضرت میمونہ نے سوال کیا اگر میں وہاں تک پہنچنے پر قادر نہ ہوسکی تو! آپ نے فرمایا: تو زیتون ہی بھیج دینا؛ کہ جس سے وہاں چراغ جلے، ایسا کرنے والا بھی وہاں جانے والے کا درجہ پالے گا۔

محدثین نے یہاں زیتون بھیجنے کی تلقین سے یہ مناسبت بیان کیا ہے کہ نماز چوں کہ نور ہے اور زیتون سے چراغ جلے گا، یہ بھی روشنی کا سبب بنے گا۔

حدیثِ پاک میں آپ ﷺ نے بیت المقدس جانے کی وصیت فرمائی ہے اور عدمِ استطاعتِ سفر کی صورت میں زیتون ہی روانہ کرنے کی تلقین کی ہے۔ اولاً تو نماز کے ذریعے اسے آباد کرنے کا حکم دیا اور ثانیاً چراغ وغیرہ جلا کر آباد کرنے کا، جس سے ہمیں صاف اشارہ مل رہا ہے کہ بیت المقدس کو آباد رکھنا یہ تمام امتِ مسلمہ کی ذمے داری ہے نہ کہ صرف فلسطینیوں کی۔ اور اس کے لیے ہر طرح کا تعاون جو اس کے آباد کرنے اور رکھنے میں معاون ہو، اسے بجالانا بھی ہمارا فریضہ ہے؛ حالات کے پیشِ نظر خواہ اس کی ضرورت جو بھی ہو، جانی، مالی، علمی، فکری، قلمی، لسانی، سیاسی اور سماجی جو بھی؛ ہم اس کی تکمیل کے لیے کمر بستہ ہو جائیں۔ ہر ایک اس حدیث کا خود کو مخاطب خیال کرکے اپنی استطاعت کے مطابق بیت المقدس کی آبادی اور اس کی بازیابی کی ہر ممکن کوشش کرے۔ ہر ایک خود کو اس تحریک کا ایک حصہ بنالے دوسروں کے حرکت میں آنے کا انتظار نہ کرے خود پیش قدمی کرے اور دوسروں کو قولاً، فعلاً اور عملاً اس کی دعوت دے اور بیت المقدس کی بازیابی سے متعلق بتائی جا رہی تدابیر پر عمل پیرا ہونے کا تہیہ کرلے۔

مسجدِ اقصیٰ کی زیارت اور وہاں کی موت کے لیے انبیا و صلحا کا حرص:

مسجدِ اقصیٰ یہ وہ مسجد ہے، جس کی زیارت کے لیے، جہاں نماز پڑھنے کے لیے، جہاں جائے سکونت اختیار کرنے اور اس کی مجاورت کے حصول کے لیے، انبیا و صلحا حرص اور تمنا کرتے تھے۔

بے شمار صحابہ نے اس کی زیارت کی اور وہاں سکونت اختیار کیا۔ چند نام "مسجدِ اقصیٰ عظمت ومقام" ص ۱۷ تا ۱۸ سے یہاں ذکر کرتا ہوں: بیت المقدس کی زیارت کرنے والے یا وہاں جاکر مقیم ہونے والے صحابہ، فقہا اور مفکرین کی تعداد شمار سے باہر ہے۔ ان میں سے چند ہی حضرات کا تذکرہ کیا جا رہا ہے، تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ مسلمانوں کی فکر و تہذیب میں بیت المقدس کو کیسا دینی تقدس حاصل ہے؟

ایسے لوگوں میں یہ حضرات بھی شامل ہیں: ابوعبیدہ بن جراح، ام المومنین صفیہ بنت حیی، معاذ بن جبل، موذنِ رسول بلال بن رباح، (حضرت بلالؓ نے وفات نبوی کے بعد اذان دینا ترک کر دیا تھا، لیکن پھر بیت المقدس کی فتح کے بعد آپ نے اذان دی) عیاض بن غنیم، عبداللہ بن عمر، خالد بن ولید، ابوذر غفاری، ابو درداعویمر، عبادہ بن صامت، سلمان فارسی، ابو مسعود انصاری، تمیم داری، عمرو بن عاص، معاویہ بن ابی سفیان، عوف بن مالک، ابو جمعہ انصاری رضی اللہ عنہم: یہ حضرات تو صحابہ کرام کی صف سے تعلق رکھتے ہیں۔

(ملاحظہ ہو: الانس الجلیل: ۱/۲۶۰، مجد المحام: المسلمون واسترداد بیت المقدس، ص: ۳۴، اور اگلے صفحات، مطبوعہ از ہر)

تابعین اور ممتاز فقہا میں سے یہ حضرات زیارتِ بیت المقدس یا وہاں کے قیام سے شرف یاب ہوئے:
مالک بن دینار، اویس قرنی، کعب الاحبار، رابعہ عدویہ، امام اوزاعی، سفیان ثوری، ابراہیم بن ادہم، مقاتل بن سفیان، لیث بن سعد، وکیع بن جراح، امام شافعی، ابوجعفر جرشی، بشر الحافی اور ثوبان بن یمرد۔

(ابن سعد: الطبقات الکبریٰ: ۷/۴۴۲، مطبوعہ بیروت)، ذوالنون مصری، سلیم بن عامر (ایضاً: ۷/۴۴۲)

سری سقطی، بکر بن سہل دمیاطی، ابوالعوام (موذن بیت المقدس) سلامۃ المقدس الضریر، ابوالفرج عبدالواحد حنبلی، امام غزالی، امام ابوبکر ابن العربی، ابوبکر جرجانی (الانس الجلیل: ۱/۲۸۵ اور اگلے صفحات)
ابوالحسن زہری، ان حضرات کے علاوہ سیکڑوں تابعین اور ممتاز علما اس شرف سے مشرف ہوئے۔

(مسجد اقصیٰ عظمت ومقام: ص ۱۷)

بخاری ومسلم کی روایت ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی: کہ انہیں بیت المقدس کے بالکل جوار میں موت عطا کرے، جسے آپ ﷺ نے کہا کہ آپ کی قبر کثیفِ احمر کے نیچے ایک راستے کے جانب واقع ہے۔
آیئے! اب القدس کی تاریخ کا سرسری مطالعہ کرتے ہیں:

القدس تاریخ کے تناظر میں:

☆ ۳۰۰۰ قبل کنعانیوں (یبوسیوں) نے اس کو بنایا۔
☆ ۱۸۵۰ قبل مسیح حضرت ابراہیم علیہ السلام یہاں آئے اور یہاں کے بادشاہ سے ملے۔
☆ ۹۷۰، ۹۳۱ قبل مسیح ”القدس“ پر حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت رہی۔
☆ ۵۸۷ قبل مسیح بخت نصر کے ہاتھوں یہ تباہ کر دیا گیا اور یہاں کے یہودی قیدی بنا لیے گئے۔
☆ ۱۳۵ میں رومی بادشاہ ہدریان نے یہاں سے یہود کو نکال باہر کیا۔
☆ ۴۴۰، ۶۳۶ میں القدس بزنطینی استعمار کے زیر نگیں رہا۔
☆ ۱۵ ہجری، ۶۳۶ عیسوی میں مسلمانوں نے معرکہ یرموک کے بعد ان علاقوں کو آزاد کرایا۔
☆ ۱۷ ہجری، ۶۳۸ء میں ۴۰۰۰ صحابہ نے اسے فتح کیا اور یہاں کے پادری صفرونیوس نے شہر کی چابیاں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے حوالے کیں اور معاہدہ کیا۔
☆ ۴۹۳ ہجری، ۱۰۹۹ء میں صلیبیوں نے یہاں پر قبضہ کیا۔
☆ ۵۸۳ ہجری، ۱۱۸۷ء میں معرکہ حطین میں صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ نے صلیبیوں کو شکستِ فاش دی اور القدس کو آزاد کرایا۔

☆۶۵۸ ہجری، ۱۲۶۰ء میں معرکہ عین جالوت ہوا جس میں القدس کو تاتاریوں سے آزاد کرایا گیا۔

☆۹۳۴ ہجری، ۱۵۱۶ء میں عثمانی خلافت نے اسے اپنا حصہ بنالیا۔

☆۱۳۳۶ھ ہجری، ۱۹۱۷ء میں پہلی جنگ عظیم ہوئی، خلافتِ عثمانیہ ختم کردی گئی اور القدس انگریز کے قبضے میں چلا گیا۔

☆۱۹۱۷ء میں "بالفور" معاہدہ ہوا اس کے تحت یہاں "یہودی ریاست" قائم کرنے کا وعدہ کیا گیا۔

☆۱۳۶۸ ہجری، ۱۹۴۸ء میں فلسطین کے ۷۸ر فیصد علاقے میں اسرائیلی ریاست کے قیام کا اعلان کردیا گیا۔

☆۱۳۸۷ ہجری، ۱۹۶۷ء میں یہود نے فلسطین کے باقی ماندہ علاقوں پر قبضہ کرلیا۔

☆۱۴۰۸ ہجری، ۱۹۸۷ء میں یہودیوں کے خلاف جدوجہد کا اعلان کردیا گیا۔

(اقصیٰ کے آنسو ص:۱۹/۲۰)

کیا مسجد اقصیٰ کی بازیابی ضروری ہے؟

کتاب اللہ اور فرمانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی عظمت، اس کا مقام، اس کا اسلام اور مسلمانوں سے تعلق واضح ہوچکا ہے، اس کی اہمیت وخصوصیت آشکارا ہوچکی ہے، اس کی بازیابی اس وقت کا ایک اہم فریضہ ہے؛ بل کہ میرے زعم کے مطابق اس کے بغیر مسلمان زوال کے دلدل سے نکل کر عروج کی راہ پر گامزن نہیں ہوسکتے؛ کیوں کہ بیت المقدس سے مسلمانوں کے عروج کا ایک خاص تعلق اور جوڑ ہے، یہیں سے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج ہوئی، جہاں سے مسلمانوں کو عروج ہی عروج مقدر ہوا، اور ہر جگہ کلامِ پاک میں اسے برکت والی زمین کہا گیا، ارضِ مقدسہ کہا گیا، تو جب تک اسلام میں یہ مخزنِ برکت واپس نہیں آئے گا، مجھے لگتا ہے مسلمان پنپ نہیں پائے گا، اس کی اجتماعیت قائم نہیں ہو پائے گی اور حصولِ عزت وسرخروئی بس ایک سراب ہوگا۔

بیت المقدس کی بازیابی کیسے ہو:

مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم اسے بازیاب کیوں کر کریں؟ کیا یہ ممکن بھی ہے یا نہیں؟ اس کا طریقہ کیا ہو؟ ہم یاس وناامید کے دامن کو چھوڑ کر زبانی جمع خرچ اور رسمی لکھنے اور بولنے کو ترک کر کے اپنے اوپر مسجد اقصیٰ کے تحفظ کا ذہن سوار کرلیں، اس کی فکر اوڑھ لیں اور عملی میدان میں تمام تیاری کے ساتھ آجائیں، اور اس کی کچھ ذمہ داریاں ہیں، اسے نبھانے کے لیے کمر کس لیں۔

کچھ ذمہ داریاں تو ایسی ہیں، جن کا ہر ایک کی ذات سے تعلق ہے۔ کچھ کا خاندان سے، کچھ کا اطلاعات ونشریات سے، صحافیوں اور دانشوروں سے کچھ کا تعلیمی شعبوں سے وابستہ احباب سے، کچھ کا ائمہ، مقررین اور مبلغین سے اور کچھ کا مقامی کمیٹیوں، پیشہ ورانہ اور رفاہی یونینوں اور انجمنوں سے۔

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انفراداً واجتماعاً ہر ایک اس کے لیے متحرک ہوجائے۔ مذکورہ تمام لوگوں کی کیا کیا ذمہ داریاں ہیں اور وہ اسے کس طرح انجام دیں گے؟ اسے ڈاکٹر صلاح سلطان نے اپنی کتاب "بیت المقدس آپ کو پکار رہا ہے" اور اس جیسی جو کتابیں ہیں، جس میں اس کے طریقۂ کار کو بیان کیا گیا ہے۔ اور جو لوگ اس کے لیے کوشاں ہیں ان سے روابط اور صورتِ حال کا جائزہ لے کر تمام بھید بھاؤ بھلا کر حب مال وجاہ کو چھوڑ کر ﴿ان اللہ اشتریٰ من المؤمنین انفسہم واموالہم بان لہم الجنة﴾ کو سامنے رکھ کر عملی میدان میں کود پڑیں تو یہ عظیم کام ان شاء اللہ سہل ہوجائے گا۔

کچھ اہم وضروری طریقۂ کار وذمہ داریاں:

ان کے علاوہ کچھ نہایت اہم ذمہ داریاں بھی ہیں، جن کو بروئے کار لانا نہایت ضروری ہے۔ اس میں سے سب سے اہم تحفظِ ایمان ومسلمان ہے۔ یعنی جس طریقہ سے وہ ہمارے ایمان کو اندر ہی اندر کھوکھلا کیے جارہے ہیں، بل کہ موجودہ نسل تو بالکل ہی ایمان کی حلاوت سے محروم ہے، قساوت ہی قساوت پھیل رہا ہے۔ انہوں نے جو حربے استعمال کر رکھے ہیں اور ایمان کو ختم کرنے کی جو زہریلی فضا قائم کر رکھی ہے، اس سے امت کو بچانا نہایت ضروری ہوگیا ہے۔ ہمیں ان امراض کی نشاندہی کرنی ہوگی، امت کے سامنے اسے لانا ہوگا، اس کے نقصانات بتانے ہوں گے، بیت المقدس کی بازیابی ایمان کی بازیابی پر موقوف ہے۔ سب سے پہلے ہمیں جو ہتھیار تیار کرنا ہے، وہ ایمانی قوت کو بحال کرنا ہے، اسی پر سارا دارومدار ہے۔

فوری ذمہ داریاں:

بہر حال جو لوگ کچھ بیدار ہیں، وہ اس مہم اور عملِ خیر میں پوری تیاری کے ساتھ لگ جائیں۔ ہر جماعت کے قائد ورہنما کو ہم اس کے تئیں بیدار کریں، وہ اپنے ماتحتوں میں اس کی روح پھونک دیں اور پھر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوکر ہم ایسی کوشش کریں، جو واقعی مؤثر ہو۔ مدارس، مساجد، اسکول، کالجز، شہر، قریہ اور ہر جگہ کا مسلمان اس کے تئیں بیدار ہوجائے۔

اندرونی محنت:

مغربی تہذیب کی مسموم فضا سے خود کو اور اپنی نسل کو بچانا نہایت ضروری ہوچکا ہے۔ اس کے لیے حرکت میں آنا، بل کہ سربکف ہونا نہایت ضروری ہے، اس کے بغیر اللہ سے ہمارا رشتہ جڑ نہیں سکتا، اس کی مدد اور نصرت آنہیں سکتی، ہمارا رعب قائم نہیں ہوسکتا، ہماری تہذیب باقی نہیں رہ سکتی، ہمارا ایمان محفوظ نہیں رہ سکتا، ہمارے شعائر کو تحفظ نہیں مل سکتا۔

طریقۂ کار:

ائمۂ مساجد بیدار ہو جائیں! اللہ فی اللہ کمر بستہ ہو جائیں، پنج وقتہ نمازوں کے علاوہ روزانہ مسجدوں میں تعلیمی حلقہ لگائیں، جس میں نوجوانوں اور اپنے علاقے کے لوگوں کو جوڑیں۔ اور انہیں ان تمام خرابیوں، سود کی لعنت اور اس کی مروجہ صورت، گانے بجانے کی نحوست، فلم بینی اور عریانیت، نشہ اور جوا کی خباثت ونقصانات انہیں بتائیں؛ عقائدِ اسلام سے انہیں واقف کرائیں، سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم، سیرتِ صحابہ انہیں سنائیں، اس پر چلنے کے دینی ودنیوی فائدے بتائیں۔ اور اس طرح سے ان کے ذہنوں میں راسخ کردیں کہ یہ فلم اسٹار اور بھانڈ لوگوں کی اقتدا کو چھوڑ کر، بل کہ اسے عار سمجھ کر سنت کے دلدادہ ہو جائیں اور اوصاف صحابہ اپنانے کی کوشش کریں۔

گھروں میں اپنی عورتوں کو بتائیں اور سکھائیں، گھر میں ایک ماحول بن جائے، ہمارے گھروں سے ٹی وی کی لعنت، نوجوانوں سے موبائل میں فحشیات وفضولیات کی لت چھوٹ کر، سیرتِ رسول اور سیرتِ صحابہ کی تعلیم کا ماحول بن جائے۔ صحابہ سا ایمان پیدا کرنے کا جذبہ اُمڈ پڑے۔

ائمہ سے گزارش:

ائمہ حضرات آپ کو اللہ نے نہایت اہم منصب عطا کیا ہے۔ آپ صرف نمازوں کی امامت تک ذمہ دار نہیں، بل کہ ہم اپنے ائمۂ اسلام کو دیکھیں، حضور ﷺ کی زندگی کو دیکھیں، خلفائے راشدین کو دیکھیں، ہمارے نوجوانوں اور بچوں کی ذمہ داریاں ہم پر ہی عائد ہوتی ہیں۔

بہر صورت:

ہمیں اُن کی تعلیم وتربیت کا جنون سوار کرنا ہوگا، اس کی فکر اوڑھنی ہوگی، مکاتب کا نظام مضبوط کرنا ہوگا، گھر گھر دینی تعلیم پہنچانی ہوگی۔

علمائے مدارس درس وتدریس میں طلبہ کے درمیان ان سازشوں کو بیان کریں، اس کے لیے تیاری کی ترغیب دیں، اور ان کے اندر خدمتِ ایمانی کا جذبہ پیدا کریں۔

تاکہ یہ نسل جب امت کے سامنے آئے، تو وہ خدمتِ دین اور تحفظِ ایمان کے جذبے سے سرشار ہو، اسے صرف ایک ہی دُھن سوار ہو کہ مسلمان، مسلمان بن جائیں۔

آخر میں، میں یہی عرض کروں گا کہ ہم فاتحِ اول حضرت عمر فاروقؓ اور فاتحِ ثانی صلاح الدین ایوبیؒ کی سیرت کا مطالعہ کریں۔ ان کی تاریخ کو پڑھیں اور انہوں نے کس طریقے سے بیت المقدس کو بازیاب کرایا تھا، وہ طریقہ اختیار کریں یا اس کا میدان بنائیں۔ ان کی ایمانی حالت کیا تھی، ان کا جذبہ کیا تھا، ان کا مقصد کیا تھا، ان کی فکر کیا تھی، ان کا طریقہ کیا تھا؟ اسے سامنے رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور راستے سے ہمیں کامیابی ملے، مجھے امرِ محال لگتا ہے۔ اللہ ہمیں ان باتوں کو عمل میں لانے کی قدرت وتوفیق مرحمت فرمائے۔

قبلۂ اول بیت المقدس کیوں اور کیسے؟!!

بقلم: مفتی عبدالقیوم صاحب مالیگانوی / استاذ جامعہ اکل کوا

بیت المقدس قبلۂ محبت وعقیدت:

عالم اسلام کا سب سے بڑا بحران اختلاف اور تنازعہ ہے۔ جس کی وجہ سے مسلمان آپس میں لڑ رہے ہیں اور یہی مشکل بہت سارے مسلم ممالک میں پائی جاتی ہے۔ امریکی صدر ٹرمپ کی طرف سے بیت المقدس کو اسرائیل کا دارالحکومت قرار دینے کا اعلان ایک دوسرا بحران ہے، جو عالمی بحرانوں میں شامل ہو چکا ہے۔ یہ بہت بڑا چیلنج اور سخت امتحان ہے۔ اگرچہ ماضی کے ادوار میں تاریخی لحاظ سے بیت المقدس کی چابیاں ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہو چکی تھیں، لیکن گذشتہ صدیوں میں اس کا کنٹرول مسلمانوں کے ہاتھوں میں رہا ہے۔ اب ایک نوزائیدہ اور ناجائز صیہونی ریاست نے نہ صرف فلسطین پر قبضہ کر رکھا ہے، بل کہ یہ لوگ بات چیت، مذکرات اور انصاف کے نفاذ پر یقین ہی نہیں رکھتے ہیں۔ بہت سارے سپر پاورز اس ریاست کی غیر منطقی حمایت بھی کرتے ہیں، امریکی فیصلہ سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہو چکے ہیں، کیوں کہ بیت المقدس تمام عالمِ اسلام کا مرکزِ اول اور قبلۂ محبت وعقیدت ہے۔ اور کیوں نہ ہو، جسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی ترقی اور تمام انبیا علیہم السلام پر فوقیت وبرتری کا نقطۂ آغاز بنایا گیا ہے۔ جہاں امام الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام ہی رسولوں کی امامت فرما کر اپنی مقتدائیت کا اظہار کیا۔

کفر واسلام کی جنگ تا قیامت جاری رہے گی:

اس قبلۂ اول سے مسلمانوں کا ہمیشہ سے جذباتی اور روحانی تعلق رہا ہے، جسے کسی دم، کسی لمحہ اور کسی طریق سے ختم تو کیا؛ کم بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جس کی بازیابی کے لیے حضرت عمرؓ کی قیادت وسربراہی میں حضراتِ صحابہ جیسے نفوس قدسیہ نے کیسی کیسی قربانیاں پیش کی تھیں؟ بل کہ بیت المقدس کو غاصبوں، ظالموں اور ظلم وبربریت کی علامت قوم یہود سے واپس لینا سیدنا عمر فاروقؓ کی زندگی کا سب سے عظیم مقصد اور اپنی خلافت کا بڑا سنہرا خواب تھا؛ جسے بالآخر اللہ رب العزت نے پورا کر دیا اور بیت المقدس میں حضرت عمرؓ کے داخلہ کے دن سے لے کر خلافتِ بنو امیہ اور خلافتِ عباسیہ کے سنہرے دور تک عیسائی دنیا بیت المقدس کی طرف میلی آنکھ اٹھانے کی ہمت بھی نہ کر سکی۔ لیکن جب خلافت عباسیہ کا وہ عہد جاتا رہا، جسے سنہرے دور سے تعبیر کیا جاتا ہے اور گیارہویں صدی کے اختتام پر جب خلافتِ عباسیہ شیعی تسلط اور اہلِ فارس کی ریشہ دوانیوں سے ضعف اور اضمحلال کی انتہا کو پہونچ گئی، عالمِ اسلام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگا، مسلم حکمرانوں اور والیوں کے درمیان اقتدار کی باہمی رسہ کشی اپنے عروج کو پہونچ گئی، عالمِ اسلام کے قلب مصر وشام پر شیعوں کے قبضہ نے مسلمانوں کی رہی سہی قوت توڑ دی، یورپین عیسائی دنیا نے ان حالات کو اسلام کے خلاف اٹھنے کا سنہرا موقع

جانا، مسلم حکمرانوں کی بے غیرتی اور تساہل پرستی اور خصوصاً عام اہلِ اسلام دین بیزاری کے نتیجہ میں ایک بار پھر ہمارا قبلۂ اول یہودی سازشوں کا شکار ہو کر اُن کے ناپاک اور ناجائز قبضہ میں چلا گیا اور ایک بار پھر امت مسلمہ ایک گہرے اور جلد مندمل نہ ہونے والے گھاؤ اور زخم سے دوچار ہوگئی۔ اور ساڑھے ۴۰۰ سال بعد ۱۰۹۹ء میں صلیبی بیت المقدس پر قابض ہو گئے، جس سرزمینِ مقدس پر حضرت عمرؓ نے ۶۳۷ء میں بنفسِ نفیس اسلام کی بالادستی کا اعلان فرمایا تھا اس پر یہودی غالب ہوگئے۔ بیت المقدس پر اسلام وعیسائیت اور یہودیت کی جنگ تاقیامت جاری رہے گی، مسلمانوں کے اوپر اس مقدس سرزمین پر پرچم توحید کی بلندی اور دشمن کے قبضہ ہونے کی صورت میں اس کی بازیابی ایسی ذمہ داری ہے جس سے وہ کسی بھی حال اور عہد میں بری الذمہ نہیں ہوسکتے۔ چناں چہ دوبارہ خداوند کریم نے اس قبلۂ اول کی بازیابی کا تاج خالد بن ولید کے فرزند، عقابی روح کے مالک، بے مثال قیادت اور جنگی مہارت کے خوگر، ملت اسلامیہ کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے تڑپنے والے اور تمام ہی صیہونی وصلیبی اسلام دشمنوں کی نیند اڑا دینے والے سلطان صلاح الدین ایوبی کو پہنایا اور ۲۷ رجب المرجب ۵۸۳ھ مطابق ۱۲ اکتوبر ۱۱۸۷ء بروز جمعہ ملکوتی جلو میں مجاہدین اپنے قائد کے ساتھ شب معراج کو اس مقدس شہر میں داخل ہوئے۔ صلیبی ہتھیار ڈال کر سرنگوں تھے اور شہر کی فصیلوں پر اسلامی پرچم لہرانے لگا۔

اپنے حق کی لڑائی جاری رکھی:

شب اسراء ومعراج میں بیت المقدس کی بازیابی اس حسن اتفاق سے پوری اسلامی دنیا کے گوشہ گوشہ میں مسلمانوں کے دل اس فوج اور اس کے قائد کے ساتھ دھڑکنے لگے تھے۔ اور تقریباً ۷۶۰ سال یعنی ۱۹۴۷ء تک بیت المقدس پر اہلِ فلسطین کا مکمل کنٹرول اور قبضہ رہا، لیکن اسے ستم ظریفی کہیے یا پھر شامتِ اعمال کہ ۱۹۴۸ء میں برطانیہ نے فلسطین کے سینہ پر ریاست اسرائیل کا قیام کرواکے پوری ملتِ اسلامیہ کو اذیت اور کرب میں مبتلا کر دیا۔ اور آج اس ناجائز ریاست کا فلسطین کے ۸۰ رفیصد حصہ پر قبضہ ہے اور خود فلسطین جو اصل باشندے اور اس کے وارث ہیں، اپنی ہی سرزمین پر ثانوی درجہ کے شہری ہوگئے اور مزید انہیں ان کے حقوق واجبہ سے بھی محروم کیا گیا۔ اس وقت سے اب تک ان عزم واستقلال کے پہاڑوں اور نسبتِ فاروقی کے علم برداروں نے نہ جانے کتنی جانیں قربان کیں؟ کتنے معصوموں کو کھودیا؟ کتنی دوشیزاؤں کے ارمان کو خیر باد کیا؟ لیکن برابر اپنے حق کی لڑائی جاری رکھی اور دشمنوں کے سامنے آج تک سپر نہ ہوئے۔ آج ایک بار پھر امریکہ نے بڑے ہی منصوبہ بند طریقہ سے بیت المقدس کو ناجائز اسرائیل کا دار الحکومت قرار دینے کے فیصلہ سے پوری امت کو بے چین وبے قرار کردیا۔ اور اس نامعقول اور فضول فیصلہ سے خود اپنوں میں بھی بے آبرو اور بے وزن ہوگیا، لیکن ہٹ دھرمی اتنا؛ کہ ساری دنیا اور اکثر ملکوں کی مخالفت کے باوجود اپنے غلط فیصلہ کو واپس لینے کے بجائے مخالفت کرنے والے ملکوں کو قرض واپسی کی دھمکی دینے میں لگا ہوا ہے۔

عالمی اجتماع گاہِ انبیا:

عزیزانِ محترم! یہ بالکل حقیقت ہے کہ قبلۂ اول کا قضیہ صرف اہلِ فلسطین کا قضیہ نہیں ہے۔ بل کہ عالمِ اسلام اور پوری مسلم برادری کا مسئلہ ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ یہ قبلۂ اول ہماری محبتوں کا مرکز، ہمارے نبی کی جائے امامت اور تمام انبیا کی حاضری کا سینٹر آخر ہمارے ہاتھوں میں گیا کیوں؟ اور اب ہم اس کو کن راہوں اور کن بنیادوں سے حاصل کر سکتے ہیں؟ تو اتنی بات تو طے شدہ ہے، جو تاریخ اسلامی کے نشیب و فراز اور اس کے عروج و زوال کی داستان سے واضح ہے کہ جب بھی امت نے اپنے فرضِ منصبی سے انحراف کیا اور آپسی اختلاف و انتشار کو اہمیت دی، سلاطین وقت اور حکمرانوں نے عیش و عشرت کو ضیق و عسرت پر ترجیح دی، خدا فراموشی کے نتیجہ میں خود فراموشی کا شکار ہوئے: تو پھر اللہ رب العزت نے اس کے اقبال کو زوال سے بدلنے اور اس کی عزت کو ذلت سے تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہی کچھ حالات بیت المقدس کے ہم سے چھن جانے اور محرومی کے ہیں۔ کیا بابری مسجد جو بابر کی یادگار اور سجدہ گاہ خاص و عام تھی، اس کو ہم نے سجدوں، نمازوں، ذکر الٰہی سے محروم کر کے اس کی روح ختم نہیں کیا، پھر دشمنوں نے اس کے ڈھانچے اور بے جان جسم کو منہدم کر دیا۔ ہاں! اس سے بالکل انکار نہیں کہ چاہے بیت المقدس کا معاملہ ہو یا بابری مسجد کا مسئلہ: اس میں اسلام دشمن طاقتوں کی نفرت، ان کا ظلم اور اپنی بالا دستی کا سکہ جمانے کا ضرور دخل رہا ہے۔ اب رہ جاتی ہے بات کہ ہم اپنی اس امانت کو کیسے حاصل کر سکتے ہیں اور اس کی بازیابی کے لیے ہمیں کیا کرنا ہوگا؟ تو ضروری ہے کہ ماضی میں ہمارے اسلاف اور اسلامی قائدین نے جن بنیادوں کو اپنا کر اور جن خطوط پر چل کر اس نازک ذمہ داری کو سنبھالا اور دوبارہ امت کو اس کی امانت دلائی، انہیں بنیادوں کو اپنا کر اور انہیں خطوط پر چل کر ہم اس کو آزاد کرا سکتے ہیں۔ اور وہ بنیادیں اور خطوط و نقوش فاتح فلسطین، فرزندِ خالد بن ولید اور قائد و سالارِ امت سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کی حیاتِ مبارکہ اور تقویٰ و طہارت سے لبریز زندگی سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ چناں چہ عبرت اور سبق کے لیے سلطان کی زندگی کے چند صفات پڑھتے چلیں۔

آئینۂ صفاتِ صلاح الدین ایوبیؒ:

مشرق و مغرب کا سورما اپنوں اور غیروں، دوست و دشمن سب کو ہر دلعزیز، بلا حدود ملک و ملت اگر کسی غازی کو دنیا میں سب سے زیادہ عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، تو وہ سلطان صلاح الدین ایوبیؒ ہے۔ سلطان کی شخصیت جہاں عالمِ اسلام میں قابلِ رشک تھی وہیں یورپ میں افسانوی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ فولادی شخصیت کے حامل، لیکن سینہ میں دردمند دل، میدان میں پہاڑ جیسی صلابت، ساتھ ہی اعلیٰ انسانی اقدار و روایات کے سب سے بڑے پاسباں، مسلمانوں کے محبوب قائد اور غیر مسلموں کے محبوب غم خوار، یہ وہ اعلیٰ

کردار اور انسانیت کی چوٹی پر فائز مسلم قائد کا نمونہ تھا؛ جسے یورپ کے حملہ آوروں نے جنگ وصلح میں بڑے قریب سے دیکھا اور ایک زمانہ تک اپنے افسانوں اور ناولوں سے لے کر لوک کہانیوں تک میں اسے اپنا ہیرو بنائے رکھا۔ آج انہیں صفات جلیلہ اور اخلاق کریمانہ شجاعت اور عزم واستقلال کی ضرورت ہے۔

گنوادی ہم نے ، جو اسلاف سے میراث پائی تھی ☆ ثریا سے زمین پر آسماں نے ہم کو دے مارا

بیت المقدس اور مسجدِ اقصیٰ پر کوئی صلح نہیں:

جہاں ہم دستور کی دی ہوئی آزادی کے مطابق اور جمہوری طریقوں پر صدائے احتجاج بلند کریں گے۔ اسی کے ساتھ مسلم حکومتوں ،بل کہ ایک ایک مسلمانوں کو اس سلسلہ میں صاف فیصلہ کرنا ہوگا کہ بیت المقدس اور مسجدِ اقصیٰ پر کوئی صلح نہیں ہوسکتی۔ اسرائیل نے جو ہم سے طاقت چھینا ہے اس کو وہ بات چیت اور مذاکرات کی میز پر نہیں دے گا۔ اہلِ فلسطین نے تو کمر کس لی ہے اور وہ انتفاضہ کے راستہ پر چل پڑے ہیں، اللہ ان کا مددگار ہو۔ اگر مسلم ممالک اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے اس وقت طاقت سے مقابلہ کی پوزیشن میں نہیں ہیں ،تو پھر ظلم واستبداد کو زبان وقلم سے مسترد کرتے رہیں یہ بھی ایک طرح کی مزاحمت ہے۔ وہ حکومتیں جو ان حالات میں بھی بیت المقدس کی حمایت میں اپنے امکانات کو استعمال نہیں کررہی ہیں ،ان کے عوام کا فرض ہے کہ وہ ان کے خلاف احتجاج کریں اور اس نفاق کی پردہ دری کریں۔ جہاں تک ممکن ہو ہمیں اپنے حالات کے مطابق اس قضیہ میں حصہ لینا چاہیے۔ ظلم اور فلسطین پر ناجائز قبضہ کی مذمت ہی سہی، اسرئیل اگر اب ایک حقیقت ہے تو ظالم وناجائز حقیقت بھی ہے اور ہمارا فرض ہے کہ اس ناجائز حقیقت کو ختم کریں۔ اس کے بڑھتے ہوئے ناپاک اور منحوس قدموں کو نہ صرف روکیں ،بل کہ توڑ دیں۔ تاکہ اسے اچھی طرح سمجھ میں آجائے کہ جان لینے سے زیادہ ناموسِ رسالت اور ناموسِ شریعت پر جان دینا ہمارے لیے سستا اور بڑے نفع کا سودا ہے اور جان دے کر کامیابی کا یقین کرنا، ہمیشہ سے ہمارا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ اب ضرورت ہے کہ مسلم حکمراں اپنے میکدوں اور عیش وعشرت کے محلات سے اپنے کو نکالیں اور خدا کی طرف سے دی ہوئی ذمہ داری کو نبھائیں اور امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ اور سلطان صلاح الدینؒ کی یادوں کو از سرِ نو زندہ کریں۔

خاموش مزاجی تمہیں جینے نہیں دے گی ☆ اس دور میں جینا ہے تو کہرام مچادو

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے ☆ دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

اللہ رب العزت تمام مسلم حکمرانوں کو خصوصاً اور پوری ملتِ اسلامیہ کو عموماً اپنی ذمہ داری کا خوب سے خوب احساس عطا فرمائے۔ اور ان صفات واقدار سے مزین فرمائے جو اس نازک فریضہ سے سبکدوشی کے لیے لازم ہے، اللہ ہم کو قبلۂ اول کی بازیابی کے لیے قبول فرمالے! آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم

آؤ بیت المقدس کی سیر کریں!

نگارش: ابوعالیہ نازقاسمی، مدھوبنی۔ استاذ جامعہ لکل کوا

فضائل بیت المقدس:

قرآن کریم میں بیت المقدس یا یروشلم وغیرہ کے الفاظ کی صراحت کے ساتھ تو کہیں بھی ذکر نہیں ہے۔ پھر بھی بیت المقدس کی فضیلت واہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے صرف اتنی بات ہی کافی ہے، کہ خود رب ذوالجلال والاکرام نے قرآن کریم میں اس کا ذکر برکت وقدسیت جیسے الفاظ سے فرما کر الی یوم النشور محفوظ فرما دیا ہے۔ ذیل میں چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا﴾ الاسراء:۱

ترجمہ: پاک ہے وہ ذات؛ جو ایک رات اپنے بندے کو مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) تک، جس کے گرد اگرد ہم نے برکتیں رکھی ہیں؛ لے گیا۔ تاکہ ہم اُسے اپنی قدرت کی نشانیاں دکھائیں۔

﴿وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ كَانُوْا یُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا﴾ الاعراف:۱۳۷

ترجمہ: اور جو لوگ کم زور سمجھے جاتے تھے، ان کو زمین شام کے مشرق ومغرب کا؛ جس میں ہم نے برکت دی تھی، وارث کردیا۔

﴿یٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ﴾ المائدۃ:۲۱

ترجمہ: تو بھائیو! تم ارض مقدس (ملک شام) میں، جسے خدا نے تمہارے لیے لکھ رکھا ہے، چل داخل ہو۔

﴿وَنَجَّیْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَی الْاَرْضِ الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا لِلْعٰلَمِیْنَ﴾ الانبیاء:۷۱

ترجمہ: اور ابراہیم اور لوط کو اُس سرزمین کی طرف بچا نکالا، جس میں ہم نے اہل عالم کے لیے برکت رکھی تھی۔

﴿وَلِسُلَیْمٰنَ الرِّیْحَ عَاصِفَةً تَجْرِیْ بِاَمْرِهٖٓ اِلَی الْاَرْضِ الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا﴾ الانبیاء:۸۱

ترجمہ: اور ہم نے تیز ہوا سلیمان کے تابع کردی تھی۔ جو اُن کے حکم سے اُس ملک میں چلتی تھی جس میں ہم نے برکت دی تھی۔

اہل سبا کی خوش حالی اور ان کی فارغ البالی کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشادِ رحمانی ہے:﴿وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِي بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً﴾سبا:۱۸

ترجمہ: اور ہم نے ان کے اور شام میں ان کی بستیوں کے درمیان، جن میں ہم نے برکت دی تھی ایک دوسرے کے متصل دیہات بنائے تھے، جو سامنے نظر آتے تھے۔

اب حدیث پاک سے موتی چنیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:"**لاتشد الرحال الا الیٰ ثلاثة مساجد: مسجدی هذا،والمسجدالحرام، والمسجدالاقصیٰ**". (یعنی شرعی طور پر) صرف تین ہی مسجدیں ایسی ہیں، جن کی زیارت کی غرض سے سفر کیا جاسکتا ہے۔ میری یہ مسجد (مسجد نبوی مراد ہے) مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ۔(مسلم:ج ۱/ص ۴۴۷)

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کا تذکرہ کیا، کہ کون سی مسجد زیادہ فضیلت کی حامل ہے؟ مسجد رسول صلی اللہ علیہ وسلم یا بیت المقدس کی مسجد اقصیٰ؟ تو رسالت کی زبان فیض ترجمان نے فرمایا:"**الصلاة فی المسجدالحرام بمأة ألف صلاة،والصلاة فی مسجدی بألف صلاة، والصلاة فی بیت المقدس بخمس مأة صلاة**" یعنی مسجد حرام میں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ کے برابر ہے، مسجد نبوی میں نماز کا ثواب ایک ہزار نماز کے برابر ہے، جب کہ مسجد اقصیٰ میں نماز کا ثواب پانچ سو نماز کے برابر ہے۔

(فلسطین کسی صلاح الدین کے انتظار میں:ص ۹۸/ بحوالہ: المعجم الکبیر للطبرانی)

اِن مذکورہ آیات وآثار کے علاوہ بھی ذخیرۂ احادیث میں روایتیں موجود ہیں لیکن راقم السطور طوالتِ مضمون کے خوف سے انہیں چند پر اکتفا کرتا ہے۔

بیت المقدس کو مسجد اقصیٰ کہنے کی وجہ:

عربی لغت کے اعتبار سے مسجد اقصیٰ کا مطلب ہے"دور کی عبادت گاہ" علامہ محمود آلوسیؒ (م:۱۲۷۰ھ) فرماتے ہیں:﴿**انه سمی به لانه ابعدالمساجدالتی تزار من المسجدالحرام وبینهما نحو من اربعین لیلة:وقیل لیس وراء ه موضع عبادة فهو ابعدمواضعها**﴾(روح المعانی ج:۸/ص:۹)

امام فخر الدین الرازیؒ (و: ۲۵؍رمضان المبارک ۵۴۴ھ بروز جمعہ/م: ۶۰۶ھ) لکھتے ہیں: ﴿مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا﴾ میں "المسجد الاقصیٰ" سے مراد بیت المقدس ہے اور اس میں کسی کا اختلاف بھی نہیں ہے۔ (التفسیر الکبیر: ج ۱۰/ص ۱۱۷)

علامہ بدرالدین الزرکشیؒ (و: ۷۴۵ھ بہ مقام قاہرہ/م: ۷۹۴ھ بہ مقام مصر) تحریر فرماتے ہیں کہ: بیت المقدس کو مسجد اقصیٰ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ مسجد حرام (بیت اللہ) سے مسافت کے اعتبار سے بہت دور ہے۔ اس میں عبادت کا ثواب بھی دوگنا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اُس زمانے میں اس کے علاوہ اتنی دور کوئی اور عبادت کی جگہ نہیں تھی۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ اقذار اور خبائث سے دور ہے۔

بیت المقدس کے دیگر نام:

بیت المقدس کا ایک نام "شہرِ قدس" بھی ہے۔ اس کے علاوہ (۱) بیت القدس (۲) یروشلم بزبان عبرانی بمعنی دارالامان (۳) جیبوس (۴) ایلیا (۵) البلاط۔ یعنی دربار یا شاہی محل (۶) بابوش (۷) سنہری شہر GoldenCity (۸) یوری سلیم (۹) صیہون (۱۰) بیت السلم وغیرہ۔ اس طرح امام زرکشیؒ نے اپنی مایہ ناز کتاب "اعلام الساجد باحکام المساجد" میں کل ۱۷ نام ذکر کیے ہیں۔

تعمیر مسجد اقصیٰ:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کی تعمیر کے ۴۰ سال بعد سرزمینِ فلسطین میں مسجد اقصیٰ تعمیر کی۔ اس طرح اگر دیکھا جائے، تو مسجد اقصیٰ تاریخ عالم کی دوسری اور ﴿اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ کے بعد عبادت خداوندی کی خاطر اللہ کی زمین پر بنائی جانے والی پہلی مسجد ہے۔ مسجد اقصیٰ بیت المقدس کی سب سے بڑی مسجد ہے۔ دنیا کے نقشے پر کوئی بھی مسجد اس سے زیادہ طویل وعریض نہیں ہے۔ البتہ ممکن یہ ہے کہ اس سے زیادہ وسیع اندلس کی "مسجد قرطبہ" ہو۔ کیوں کہ روایات کے مطابق اس کی چھت اقصیٰ سے بڑی ہے۔ پھر بھی صحنِ اقصیٰ (احاطہ حرم) مسجد قرطبہ کے صحن سے بڑا ہے۔

تاریخ کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ:

☆ مسجد اقصیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے معراج ہے۔

☆ یہی مسلمانوں کا قبلۂ اول ہے۔

☆ بیت المقدس وہ مبارک مقام ہے، جہاں ہزاروں انبیا کے قدم مبارک مس ہوئے۔

☆ یہی وہ جگہ ہے، جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے کلام کیا۔

☆ اسی جگہ مسلمانوں کو جنوں پر حکومت دی گئی۔

☆ یہی وہ مبارک مقام ہے، جہاں حضرت زکریا علیہ السلام کو فرزند دلبند کی خوش خبری دی گئی۔

☆ اسی سرزمین پر حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے پہاڑوں کو مسخر کیا گیا۔

☆ حضرت ابراہیم اور حضرت اسحاق علیہما السلام کی جائے وفات بھی اسی جگہ ہے۔

☆ یہی وہ مقام مقدس ہے، جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی۔

☆ اور میدان حشر بھی یہیں سے برپا ہوگا۔ اس لیے حدیث کی کتابوں میں مکہ مکرمہ زادہا اللہ شرفا وعظما کو "مبدأ الارض" اور اس سرزمین بیت المقدس کو "**ارض المحشر**" بھی کہا گیا ہے۔

شرفِ عظیم:

تاریخ عالم میں یہی وہ اکلوتی مسجد ہے، جس کے شرف وعظمت کو روئے زمین کا کوئی حصہ نہیں پا سکتا۔ اس بارے میں طارق محمد السویدان لکھتے ہیں: **پہلا شرف:** "**ھو اول القبلتین**" یعنی قبلۂ اول ہے۔ **دوسرا شرف:** "ثانی المسجدین" یعنی روئے زمین پر تاریخ کائنات کی دوسری مسجد ہے۔ **تیسرا شرف:** "ثالث الحرمین" یعنی حرم مقدس ہے۔ (فلسطین، ص ۱۲۷)

کئی بار اجڑا اور آباد ہوا:

بیت المقدس ان گنت زیارت گاہوں والا دنیا کا سب سے قدیم ترین؛ ایسا شہر ہے، جس پر ۳۳ سے زائد صدیاں گزر چکی ہیں، جیسا کہ "برٹانیکا انسائیکلوپیڈیا" میں لکھا ہے۔

یہ دنیا کا واحد شہر ہے، جو یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے لیے یکساں طور پر مقدس اور محترم ہے۔ انسانی یاد میں دنیا کا کوئی مقام بیت المقدس سے قدیم اب تک معلوم نہیں ہوسکا۔ اس نے نہ جانے کتنی بار زمانے کی گردشوں اور حالات کے اتار چڑھاؤ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا؟ یہ مقدس شہر کئی بار اجڑا اور آباد ہوا، کئی مرتبہ زلزلوں کی مار سے کھنڈر میں تبدیل ہوا۔ ☆ ۲۰ مرتبہ محصور اور ۱۸ بار از سر نو تعمیر ہوا۔ ☆ ۲ بار مکمل طور پر بربادی کے گھاٹ اترا۔ ☆ ہادریان اور شاہ بابل بخت نصر ۵۸۷ ق م کے عہد میں اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔ بیت المقدس پر تبدیلی مذہب کے بھی ۶ ادوار گذرے ہیں۔ ایک زمانہ ایسا بھی آیا ہے کہ اس پر ہل چلا کر زمین کے برابر ہموار کر دیا گیا۔ اس شہر قدیم کی تاریخ میں بہ مشکل ہی ۲۰ سال ایسے ملیں گے، جن کے دوران شہر کے باشندوں کو امن وسکون اور اطمینان کا سانس لینا نصیب ہوا ہو۔ یوں ہوتے ہوتے تاریخ اسلام کا ایک الم ناک ترین دن ۷ جون ۱۹۶۷ء مطابق ۲۸ صفر المظفر ۱۳۸۷ھ بروز بدھ بھی آن پہنچا، جس میں یہود بے بہبود نے ہزاروں مسلمانوں کو شہید کر کے بیت المقدس پر غاصبانہ قبضہ جما لیا۔

تاریخ بیت المقدس کا سرسری جائزہ:

☆ ۶۳ رق م پومپیائی نے آکر ہیکل تباہ کیا ☆ ۶۳ رق م تا ۱۳۷ رفلسطین پر رومی اقتدار ☆ ۱۶۵ رق م ہیکل کی بحالی ☆ ۱۶۸ رق م انطوخیوس نے ہیکل تباہ کیا ☆ ۵۲۰ رق م تعمیر ہیکل زرو بابل بن سالتی ☆ ۵۳۲ رتا ۵۳۸ رق م فلسطین فارس کے زیر اقتدار رہا ☆ ۹۷۰ رق م حضرت سلیمان بن داؤد علیہ السلام نے ہیکل تعمیر کیا ☆ ۴ء میں ولادت حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہوئی اور ۱۶ ر اپریل ۳۰ء کو بیت المقدس ہی میں صلیب پر چڑھانے کی ناپاک کوشش کی گئی ☆ ۷۰ء میں طیطس رومی نے یروشلم کو تباہ و برباد کر دیا ☆ ۱۳۵ء میں رومیوں نے معبد کو گرا کر ہل چلا دیا ☆ ۵۳۲ء حضرت مریم کے گرجا کی تعمیر ہوئی ☆ ۶۱۴ء میں خسرو نے بیت المقدس پر قبضہ کیا ☆ ۹ر مارچ ۶۲۰ء مطابق ۲۷ ر رجب ۱۱ رنبوی بروز جمعرات کو واقعہ معراج پیش آیا ☆ ۲۰ ر اگست ۶۳۶ء میں خلیفۂ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فتح کا جھنڈا لہرایا اور مسجد عمر کی بنیاد رکھی ☆ ۶۹۱ء میں عبدالملک نے قبۃ الصخرۃ تعمیر کروایا ☆ ۶۳۷ء تا ۱۰۹۹ء اسلامی شہر رہا ☆ ۸۳۱ء میں مامون رشید بن ہارون رشید نے قبۃ الصخرۃ کی مرمت کروایا ☆ ۱۰۹۹ء میں پہلی صلیبی جنگ ہوئی ☆ ۸۸ رسال بعد ۲۷ ر رجب المرجب ۵۸۳ھ مطابق ۲ر اکتوبر ۱۱۸۷ء بروز جمعہ کو صلاح الدین ایوبیؒ (و: ۱۱۳۷ء مطابق ۵۳۲ھ/م: ۳ر مارچ ۱۱۹۳ء مطابق ۵۸۹ھ بروز: منگل، بہ مقام تکریت) نے فتح کیا اور مسجد اقصیٰ کے ساتھ مسجد صخرہ کو بھی نجاستوں سے پاک کیا ☆ ۱۲۱۲ء میں بچوں کی صلیبی جنگ ہوئی ☆ ۱۵۳۷ء تا ۱۵۴۲ء بیت المقدس میں تعمیرات سلیمان اعظم کا سلسلہ جاری رہا ☆ ۱۸۷۲ء میں صیہونیت کی پہلی چنگاری ایک روسی یہودی "کرسٹوکر" نے روشن کی ☆ ۱۸۹۷ء میں باسل کے مقام پر پہلی صیہونی کانفرنس منعقد ہوئی ☆ ۲ر نومبر ۱۹۱۷ء تک یہ قبضہ مسلمانوں کے پاس رہا ☆ ۱۹۱۷ء میں یروشلم پر فرنگیوں نے قبضہ کیا ☆ ۱۹۴۸ء میں بیت المقدس ایک بار پھر سے اسلامی شہر بنا ☆ ۱۹۶۷ء مطابق ۱۳۸۷ھ میں یہودیوں کا تصرف ہو گیا جو تادم تحریر موجود ہے ☆ ۱۹۶۹ء میں ایک آسٹریلوی یہودی نے مسجد اقصیٰ کو نذر آتش کرنے کی ناپاک کوشش کی۔

مسجد اقصیٰ کا رقبہ:

مذکورہ مسجد کا کل رقبہ (۱۴۰۰۰) مربع میٹر ہے، جو فصیل بند شہر قدس کا چھٹا حصہ ہے۔ یہ غیر مربوط گوشوں پر مشتمل ہے۔ مغربی گوشے کی لمبائی ۴۹۱ ر میٹر، مشرقی گوشے ۴۶۲ ر میٹر، شمالی گوشے ۳۱۰ ر میٹر اور جنوبی گوشے کی لمبائی ۲۸۱ ر میٹر ہے۔ اس رقبے میں جب سے مسجد بنی ہے، اس وقت سے اب تک کوئی کمی بیشی واقع نہیں ہوئی۔ جب کہ مسجد حرام اور مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں بار بار توسیع ہوتی رہی ہے۔

(فلسطین کسی صلاح الدین کے انتظار میں: ص ۱۱۸، ۱۱۹)

مساحت وابواب:

مسجد اقصیٰ شمالاً جنوباً ۴۹۰ رفٹ لمبی اور عرض شرقاً غرباً ۱۷۰ ارفٹ ہے۔ مسجد کے گرد مضبوط فصیل ہے، جس میں داخل ہونے کے لیے کل ۱۴ ار دروازے ہیں۔ اُن میں سے ۱۰ ار دروازے آج بھی زیر استعمال ہیں، جب کہ ۴ ر دروازوں کو سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے حفاظتی نکتہ نظر سے بند کروادیا تھا۔

موجودہ صورت حال:

یہ ہے کہ مسجد اقصیٰ کا انتظام اردنی وزارت اوقاف وامور مقدسات اسلامیہ کے ماتحت ہے لیکن مسجد اقصیٰ پر ۱۹۶۷ء مطابق ۱۳۸۷ھ سے یہودیوں کا قبضہ ہے۔ صیہونی حکومت غیر اعلانیہ طور پر یہودی دعویٰ کی تائید کرتی اور اس راہ میں آنے والے کانٹوں کو ایک ایک کر کے چننے میں لگی ہوئی ہے۔ یہودیوں کا ایک بے بنیاد عقیدہ یہ ہے کہ مسجد اقصیٰ ''ہیکل سلیمانی'' کے ملبے پر واقع ہے، شہر قدس کے بغیر ریاست اسرائیل اور ہیکل کے بغیر شہر قدس بے معنی ہے۔ انہدام مسجد اقصیٰ یہودیوں کا سب سے بڑا ہدف ہے، جس کے لیے انہوں نے کئی طرح کی کارروائیاں کرلی ہیں اور باقی ماندہ پروگراموں کو برپا کرنے کے لیے سنجیدگی سے درپے ہیں۔

مسجد اقصیٰ کی مغربی دیوار کے ایک حصہ کو علاحدہ کر کے ''دیوار گریہ'' کا نام دے کر مسلمانوں کو اُس کے نزدیک جانے سے بھی روک رکھا ہے۔ کئی بار جلانے، گرانے اور بم سے اڑانے کی کھلے عام کارروائی کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ مسجد کے نیچے سرنگیں کھود ڈالی ہیں اور بہانے بہانے سے کھدائی کا کام کرتے ہی رہتے ہیں۔ اس وجہ سے مسجد اقصیٰ کے کچھ حصوں میں دراڑیں بھی پڑ گئی ہیں۔ نماز کے لیے مسجد میں مسلمانوں کا آزادانہ آمدورفت بھی نہیں ہے۔ مسجد کی دیکھ بھال اور مرمت پر بھی پابندی ہے۔

قارئین کرام: دعا کریں کہ اللہ رب العزت؛ جس نے ہلاکت نمرود کے لیے مچھر اور ابرہہ کے لشکر کی تباہی کے لیے ابابیل کو بھیجا تھا، وہ ایک بار پھر اپنی قدرت سے بیت المقدس کی بازیابی کے لیے کسی صلاح الدین ایوبی کو بھیج دے۔



حذر اے چیرہ دستاں کہ سخت ہے قدرت کی تعزیریں

(فلسطین کے تناظر میں)

بقلم: مولانا ناظم صاحب ملی/ استاذ جامعہ اکل کوا

قرآن وحدیث کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ مترشح ہوتا ہے کہ اس جہانِ رنگ وبو کا فتنۂ کبریٰ دجالِ اکبر ہے۔ اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس فتنہ کا مرجع وماویٰ ارضِ مقدس ہوگی۔ دجالِ اکبر کا ظہور بھی یہیں ہوگا اور وہ ناپید بھی اسی ارضِ مقدس خاکِ فلسطین پر ہوگا۔ اس سرزمین کے صحیح حق داروں اور جھوٹے دعویداروں کے درمیان صدیوں سے پیکار جاری ہے اور مستقل تثلیث کے علم برداروں اور یہود بے بہبود کی ملی جلی سازش سے ایک طویل عرصہ سے جنگ کا ماحول بنا ہوا ہے اور مؤرخین کے بقول انسانی خوں آشام تاریخ یہاں ہمیشہ اپنے آپ کو دہراتی رہی ہے۔

یہ محقق ہے کہ عیسائیت ویہودیت ان کی اپنی خرمستیاں، نادانیاں اور بدبختیاں لے ڈوبی۔ ازمنۂ قدیم میں خالقِ ارض وسما نے ان دونوں ناہنجار قوموں کو ارضِ مقدس کی تولیت خصوصاً مسجدِ اقصیٰ کی خدماتِ جلیلہ تفویض فرمائی تھی، لیکن یہود بے بہبود اور نصاریٰ خاسرہ نے اس کے تقدس وحرمت پر تیشہ چلایا اور اس کی خدمت کا کماحقہٗ پاس ولحاظ اور پاسبانی کا احساس نہ کیا، تو خدائے پاک اور بزرگ برتر نے اس کی تولیت ان سے چھین لی اور امتِ محمدیہ ﷺ کو اس کا امین وپاسبان بنا دیا۔ تاریخ کا یہ ایسا عظیم سچ ہے جس کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا، چناں چہ حرمین شریفین کے بعد امتِ محمدیہ کے لیے یہ اب تیسرا اہم اور باعظمت مقام ہے۔

امتِ محمدیہ ﷺ کے لیے بیت المقدس کی اہمیت:

نصوصِ قطعیہ سے یہ ظاہر ہے کہ ارضِ مقدس ہی میں حشر برپا ہوگا اور آخر زمانہ میں ملکِ شام ہی میں اسلام کا بول بالا سب سے نمایاں ہوگا۔ جس ملکِ شام کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ یہ آج کا ملک شام نہیں، جس کا جغرافیہ سکڑ گیا ہے، بل کہ قدیم زمانہ میں ملک شام کا رقبہ ارضِ مقدس بشمول اسرائیل واردن وغیرہ پر مشتمل تھا۔

علامہ ابن تیمیہؒ ایک جگہ رقم طراز ہیں: ارضِ شام ہی میں مسجدِ اقصیٰ ہے اور یہیں انبیائے بنی اسرائیل کی بعثت ہوئی اور اسی کی طرف حضرت خلیل اللہؑ نے ہجرت فرمائی۔ اور یہیں آپ ﷺ کی امت کی جماعتِ منصورہ پائی جائے گی یہیں محشر ومعاد روبہ عمل آئے گا، یہ طائفہ منصورہ والی حدیث جس کے متعلق محدثین عظامؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث متواتر ہے اور مختلف الفاظ کے ساتھ وارد ہوئی ہے۔

امام مسلمؒ اپنی تصنیف میں ان الفاظ کے ساتھ نقل فرماتے ہیں: ”لاتزال عصابة من أمتي‘ تقاتلون علی أمر اللہ وهم کذلک“ میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حکمِ الٰہی پر قائم رہے گا، ان کے مخالفین انہیں ضرر نہیں پہنچا سکیں گے، وہ قیامت تک اسی روش پر قائم رہیں گے۔

اس حدیث کے پیش نظر امت کے وہ اکابرین؛ جو کتاب وسنت میں درک وتبحر رکھتے اور وہ اس فن کے عارفین وکاملین میں سے ہیں، وہ فرماتے ہیں: آج کے اس پُرفتن اور دجل وشیطنت کے پُرفریب ماحول میں دشمنانِ دین متین اور وعدوان اسلام کا مضبوط پوزیشن میں ہونے کے باوجود ان کا نت نئے ہتھیاروں سے لیس ہونے کے باوجود آج بھی فلسطینی مسلمان اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر دشمنوں کے نئے اسلحہ جات کا جواب غلیل اور ابابیل کے کنکروں اور پتھروں سے دے کر میدان میں سینہ سپر ہیں۔تو وہ اسی طائفہ منصورہ کا تسلسل ہے، اس سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ اس مقدس سرزمین کا مسلمانوں کے پاس کیا مقام ومرتبہ ہے؟ ان کا اس سرزمین سے پیار ومحبت، نسبت اور لگاؤ یوں ہی نہیں ہے، بل کہ مسلمانوں کا اسلامی ورثہ، اس کا کلچر اور اس کی اسلامی روایات کا ایک بڑا ذخیرہ اس سے وابستہ ہے۔ہاں! وہ خطہ صرف زمین کا ایک قطعہ اور ٹکڑا ہی نہیں، بل کہ وہ مسلمانوں کا قبلۂ اول بھی ہے۔ بخاری شریف کی روایت کے مطابق آپ ﷺ نے ۱۶ ریا ۱۷ رمہینے اس طرف رخ کرکے نمازیں ادا کیں۔ ۱۵ھ مطابق ۶۳۶ عیسوی میں خود خلیفہ ثانی وہاں قدم رنجہ ہوئے اور اس مقام پر قیام فرمایا اور مسجد صخرہ کا نقشہ تیار کیا۔

قرآن پاک کے اس ارشاد﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ o﴾کے بموجب یہاں کا چپہ چپہ خدائی برکتوں، نوازشوں اور اس کی عنایتوں سے معمور ومزین ہے۔یہ بھی محقق ہے کہ اس ارضِ مقدس کو یہ تقدس اور مقام بھی حاصل ہے کہ یہاں کی خاک کا ذرہ ذرہ درختوں کا پتا پتا انبیائے صادقین، سابقین ،عارفین اور کاملین کے دیدار کا شرف حاصل کرچکا ہے۔زمانہ سابقہ میں یہاں اسلام پھلا پھولا اور پھیلا، برگ بار لایا اور ثمر آور ہوا، دعوت وعزیمت کی بڑی بڑی نامی گرامی شخصیات نے یہاں جبیں سائی کی، وحی ربانی کا نزول جبرئیل ومیکائیل اور کروبیاں کی آمد اور ملائکہ مقربین کے نزول کا ازدحام یہاں کا خاصہ رہا ہے۔

﴿يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ کہہ کر قرآن کریم نے اپنے اچھوتے انداز میں اس کی تقدیس وتکریم پر مہر ثبت کی۔اسی طرح ﴿هنالك دعا زكريا ربه﴾حضرت زکریا کی الحاح وزاری اپنے رب کو پکارنے، مدعیٰ کرنے کا راز وانداز پھر﴿انا نبشرك بغلام اسمه يحيى﴾حضرت یحییٰ کی پیدائش کی خوش خبری، پھر حضرت عیسیٰ ابن مریم کی پیدائش کے سلسلہ میں فرشتہ کا آنا اور نفخ صور کرنا﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا o فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا۪ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا o قَالَتْ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا o قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا o﴾عرش بریں سے جبرئیل کی آمد، اسلام کی رحمت اور اس کی خوش نویدی کے ساتھ ہی رزق دینے کا ایسا انوکھا انداز: کہ جاڑے کے موسم میں گرمی کے پھل اور گرمی کے موسم میں جاڑے کے پھل ہوتے تھے۔ تازہ اور شیریں کھجوروں کا جھڑنا، پھر حضرت مسیح علیہ السلام کا گہوارہ میں اپنے روبرو کھڑے لوگوں سے صاف ستھرے لفظوں میں ﴿قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا o وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ﴾ کہہ کر تمام حقائق کا انکشاف کرنا اسی سرزمین سے یہود بے بہبود کے باطل عقیدے کی تردید کرتے ہوئے﴿وما قتلوه وما صلبوه ... بل رفعه الله اليه﴾ کہ عیسیٰ علیہ السلام قتل ہوئے نہ ان کو صلیب پر لٹکایا گیا، بل کہ اللہ نے ان کو اپنی طرف اٹھالیا۔

قرآن مجید کا ان کے سروں پر ہتھوڑے لگانا، پھر لوگوں کی فرمائش پر عیسیٰ کا دعا مانگنا اور اس کے صلہ میں جنتی دسترخوان کا آسمان سے اترنا ﴿اللھم أنزل علینا مائدة من السماء﴾ یہ تمام حقائق اور نظائر برکتوں اور عنایتوں کے مخفی خزانے اور پوشیدہ راز سب تو اسی سرزمین سے وابستہ ہیں، پھر ان سب سے بڑھ کر جب حضور ﷺ کا عہد سعید آیا تو خلاقِ عالم حضور جل وعلیٰ نے معراج کے بابرکت سفر کے لیے اسی ارضِ مقدس کا انتخاب فرمایا، یعنی اسراء و معراج کا حسین سنگم مسجدِ اقصیٰ ہی کو قرار دیا۔

ع زنجیر میں بھی تھی جنبش بستر میں بھی تھی گرمی حیرت میں ہے عالم تیرے اقصیٰ کے سفر سے

جس شانِ یکتائی و زیبائی کے ساتھ حبیب نے اپنے محبوب کو اپنی ہمکلامی اور شرفِ دیدار سے مشرف فرمانے کے لیے اپنے محبوب کو اپنی ذات کا کھلے بندوں جلوہ دکھانے کے لیے، جنت و جہنم کا نظارہ، عجائبات سماوی کی سیر اور نظروں سے اوجھل انکشافات اپنے پاس چھپے بھیدوں کو اپنے محبوب پر واشگاف کرنے کے لیے فرشتوں کی نورانی کہکشاں (جھرمٹ) میں بڑے تپاک سے بلایا، پھر حضور ساقیِ کوثر نے یہیں سے فرشتوں کے درمیان آسمان کی طرف صعود کیا، پھر اسی پر بس نہیں، ایک مشہور روایت کے مطابق اسی مسجدِ اقصیٰ میں جبینِ نیاز جھکا کر بارگاہِ ایزدی میں ایک نماز ادا کرنا پچاس ہزار نمازوں کا ثواب رکھتا ہے۔ بس اسی بنا پر مسلمانوں کے لیے ارضِ مقدس ایک خاص اہمیت کا حامل ہے اور اس کی اسلامی روایات کا ایک خاص عنصر ہے، اسی لیے مسلمانوں کا اسی پر پورا پورا حق ہے اور اس خطے سے فلسطینیوں کی ہی نہیں بل کہ تمام امتِ مسلمہ کی وابستگی ایک والہانہ اور جذباتی قسم کی ہے، اسی لیے فلسطین کا بچہ بچہ، جوان، بوڑھا، مرد، عورت وہ قابلِ مبارک باد ہیں اور ہر طرح قابلِ احترام اور لائقِ اکرام ہیں اور ان کی امداد بہر صورت دامے درمے اور سخنے فرض ہے۔ اور مسلمانوں کا اسلامی اور اخلاقی فریضہ ہے کہ اہلِ فلسطین بالخصوص حماس اور اہلِ انتفاضہ قربانیاں پیش کر کے ساری امت کی طرف سے فرضِ کفایہ ادا کر رہے ہیں بل کہ اتمامِ حجت بھی کر رہے ہیں۔

ع وہ فریب خوردہ شاہیں جو پلا ہو کرگسوں میں اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی

یہ سیاسی مسئلہ نہیں ہے۔ دنیا یہ سمجھتی ہے کہ یہ مسلمانوں کا اپنا سیاسی مسئلہ ہے، بل کہ بعض نامراد مسلمان اپنی لاعلمی کی بنا پر اس کو عربوں کا علاقائی مسئلہ سمجھتے ہیں۔ ہرگز نہیں، حاشا وکلا! اس کو سیاست سے جوڑنا ہی حماقت ہے۔ نا ہی یہ علاقائی مسئلہ ہے، نہ صرف عربوں کا اپنا مسئلہ ہے، بل کہ یہ تو سارے عالمِ اسلام کا ایک اٹوٹ اور اہم مسئلہ ہے۔

اسلامی حکومتیں اور ہر سنجیدہ مسلمان اس پر سنجیدگی سے سوچنے کا مجاز ہے اور اس وقت تک اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ اور سبکدوش نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی بازیابی نہ ہو جائے۔ ٹرمپ کی اس نادانی سے مسلمان کبھی بھی بے حوصلہ نہیں ہوں گے۔

فلسطین اسلام کے سایۂ عاطفت میں:

اور اخیر عہدِ صدیقی میں یارِ غار حضرت خلیفۃ المومنین سیدنا صدیق اکبرؓ نے ملکِ شام کی اسلامی قلمرو کا حصہ بنانے کے لیے اسلام کے مردانِ کار کے چار لشکر روانہ فرمائے۔ جس میں صوبہ فلسطین کی فتح کے لیے اسلام کے بطلِ جلیل سیدنا عمرو بن العاصؓ کو مقرر فرمایا تھا، جس زمانہ میں سیدنا ابوعبیدہ ابن الجراحؓ شمالی روم پر پیش قدمی کر رہے تھے، ادھر سیدنا عمرو بن العاصؓ کے شریکِ کار شرحبیل ابن حسنہؓ بھی امیرِ طائفہ اسلامی کے اشارہ پر مصروفِ جہاد تھے۔

حذر اے چیرہ دستاں کہ سخت ہے قدرت کی تعزیریں

جن کے مقابلہ پر رومیوں نے اپنے ایک بہادر جانباز جیالے جرنیل کو بھیجا تھا، جو انتہائی فعال، جہاں دیدہ اور جنگ آزمودہ جرنیل تھا، جس نے نت نئے ہتھیاروں اور اسلحہ جات کے ساتھ بے شمار افواج کے ہمراہ میدان کا رخ کیا تھا اور جس کا نام ''اطربون'' تھا۔ پورا ملک شام اور وہاں کی عوام اطربون کی دور اندیشی اور پیکار کی صلاحیت پر مطمئن تھی، بل کہ ان دیار میں اس کا کوئی حریف تصور ہی نہیں کیا جاتا تھا، وہ بڑا ہی خرانٹ اور ماہر جنگجو تھا، اس لیے اس کے ہوتے ہوئے فلسطین پر قبضہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ مگر اللہ کی استعانت کہ عمرو بن العاص اس کے مقابلہ پر پہنچے اور اس کو شکست فاش دی اور آگے قدم بڑھائے۔

مؤرخین لکھتے ہیں: رملہ اور یروشلم دونوں ایسے شہر تھے جہاں رومی قلعہ بند ہو کر لڑ سکتے تھے۔ چناں چہ عمرو بن العاص نے آگے بڑھ کر شہر القدس کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ شیطان کی آنت کی طرح لمبا ہوتا گیا۔ شہر کا اُسقفِ اعظم ان کو یہ حوصلہ دیتا تھا کہ گھبراؤ مت یہ شہر ان سے فتح نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ اس کا فاتح کوئی اور ہے جس کے ذریعہ یہ فتح ہوگا وہ توریت وانجیل میں موجود ہیں اور وہ نشانیاں اس لشکر میں کسی میں نہیں پائی جاتی ہیں۔

ایک دن پادری نے قلعہ کی فصیل پر کھڑے ہو کر آواز لگائی اے بدوؤ! تم یہاں سے چلے جاؤ تم اس شہر کو فتح نہیں کر سکتے ہو۔ اس لیے کہ اس کا فاتح عمر ہوگا، جس کا حلیہ ہماری کتابوں میں موجود ہے اگر خلیفہ وہی آدمی ہے تو ہم بغیر جنگ وجدل کے ہی چابیاں ان کے حوالہ کر دیں گے۔

فلسطین کی طرف حضرت عمرؓ کی روانگی:

جب عمرو بن العاصؓ اور صحابۂ کرام کی طرف سے حضرت عمرؓ کو بتلایا گیا تو عمر بن الخطابؓ نے یہ سوچ کر کہ بندگانِ خدا کا خون نہ بہے اتنے لمبے اور دور دراز سفر کے لیے حامی بھر لی۔ دوری، مسافت اور راستہ کے نشیب وفراز ایک طرف عمر کا تقاضہ مانع تھا، تو دوسری طرف قبلۂ اول کی بازیابی اور اس کی تحویل وتسخیر اور بچھڑے ہوئے وہ مردانِ کار جب کبھی مدینہ کی گلیوں میں، بازاروں میں، محفلوں اور مجلسوں میں ہم پیالہ وہم نوالہ ہوا کرتے تھے ان سے ملاقات کا شرف وشوق بھی کسی قدر حضرت عمرؓ کے دل کو آمادۂ سفر کر رہا تھا۔ ادھر غازیانِ اسلام کی خوشیوں اور مسرتوں میں جیسے شباب آچکا تھا وہ بلّیوں اچھل رہے تھے اور تکبیر وتہلیل کے فلک بوس نعروں پر نعرے لگ رہے تھے، ان نعروں سے رومی چونک گئے اور ان کو بھی روحی سرک آنی گئی۔ انہوں نے اپنے پیشوا سے پر عزم لہجہ میں کہا اے مقدس باپ! مذہبی کتاب کی روشنی میں اس شخصیت کی صحیح شناخت کیجیے ورنہ ان صحرا نشین بدوؤں کو ان کے حال پر چھوڑ دیجیے، ہم مٹ جائیں گے یا ان کو مٹا دیں گے، مگر پوپ نے تسلی دی اور ابوعبیدہؓ سے فرمایا کہ اگر آپ کے کعبۂ مقصود خلیفۃ المومنین تشریف لا چکے ہیں تو ہمارے سامنے لائیں تاکہ ہم ان کے دیدار سے مشرف ہوں اور بیت المقدس کی چابیاں ان کے سپرد کر کے اطمینان کر لیں۔

کسی ایسے شرر سے پھونک اپنے خرمنِ دل کو ۔۔۔ کہ خورشید قیامت بھی ہو تیرے خوشہ چینوں میں

امین الامت حضرت ابوعبیدہ نے عرض کیا کہ امیر المومنین اس وقت آپ ایک بڑی سلطنت کے سربراہ ہیں۔ اگر سواری اور لباس ذرا دیدہ زیب ہو تو کوئی مضائقہ نہیں، یہ جملے ابھی پورے بھی نہ ہوئے تھے کہ امیر المومنین نے جلال آمیز لہجہ میں فرمایا: ابوعبیدہ! کیا تم نے دور نبوت نہیں دیکھا؟ اور پھر اسی انداز سے فرمایا: یا ابا عبیدة! اعزنا اللّٰہ بالإسلام فمهما نطلب العز بغير ما اعزنا اللّٰہ اذلنا اللّٰہ،

یہی اصول ہے جو آج ساری امت سے چھوٹ چکا ہے، جس کی پاداش میں ہم پر ذلت ہے، ہر محاذ پر ہم مات کھا رہے ہیں اور اقبال کے فلسفیانہ کلام کا سہارا لوں تو کہا جاسکتا ہے ؎

دلِ مردہ دل نہیں زندہ کر دوبارہ   یہی ہے امتوں کے مرض کہن کا چارہ

فرمایا ابوعبیدہ یاد رکھو! مسلمان دائرۂ اسلام میں رہ کر ہی محترم و مکرم رہ سکتا ہے، اس کے علاوہ کوئی اور راستہ تلاش کرنا محرومی و بدبختی ہوگی۔

اس کے بعد وہ منظر سامنے آیا کہ پوپ آپؓ کے سراپا کو دیکھتا جاتا اور تصدیق کرتا جاتا تھا۔ جب پوپ کی تصدیق پوری ہوگئی تو رومی امیر المومنین کی طرف امن و امان کے لیے دوڑ پڑے۔

یہ پرانی زمین اور بوڑھا آسمان اپنی چشم و ابرو سے یہ نظارہ کر رہے تھے کہ دنیا جہاں کی ایک مثالی بادشاہت و شہنشاہیت، ایک ایسی اقلیم جس کو زیر کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا، جس کا شہرۂ آفاق دبدبہ اور سطوتِ سلطانی آسمان سے باتیں کرتی تھیں، وہ کس طرح ڈھیر ہو چکا تھا؟ سچ ہے

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے   مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں   یہ عاشق کون سی بستی کے یارب رہنے والے ہیں

دنیا کا یہ بارہا مشاہدہ ہے کہ دنیا میں جب جب بھی امن و امان آیا اسلام کے راستہ ہی سے آیا ہے۔

مؤرخین لکھتے ہیں کہ عہد خلیفہ ثانی میں بیت المقدس پر باقاعدہ اسلامی پھریرا لہرایا جو اسلامی وسعت کار کی صبا رفتاری کا عندیہ جس کے بعد پورا ملک شام خلافت راشدہ کا حصہ بن گیا۔

زخم کیسے لگا: اسلام کے مردانِ کار جن کا مقصد زندگی دین کی سرفرازی تھا، انہوں نے پورے خطہ شام پر جو حکومت قائم کی وہ مثالی تھی۔ بقول مؤرخین ۴۵۰ رسال تک خلافت بنوامیہ و عباسیہ کے سنہرے دور تک تثلیث کے علم برداروں اور نا ہی یہود بے بہبود نے ترچھی نگاہ سے بھی فلسطین کی طرف دیکھا۔ مگر گیارہویں صدی عیسوی میں جب سلطنتِ بنوعباسیہ جب شیعی تسلط اہل فارس کی ساز باز سے ضعف و اضمحلال کا شکار ہوگئی تو نصاریٰ خاسرہ کی امیدیں روشن ہوگئیں اور مسلمانوں کی آپسی رقابتوں نے عیسائیوں کو حملہ آور ہونے کا حوصلہ بخشا۔ اور اس طرح عیسائی دنیا مسلمانوں پر قابض ہونا شروع ہوگئی اور بقول مؤرخین ۱۰۹۹ میں تثلیث کے علم بردار بیت المقدس موجودہ (یروشلم) کو ہتھیا کے، وہ میثاقِ عمر جس کو ۴۵۰ رسال تک عملی جامہ پہناتے رہے، مگر صلیبی جیسے ہی غالب آئے، انہوں نے ساری انسانیت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ظلم و جبر کا بازار گرم کر دیا۔ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ یہودیوں کو بھی مسجد کے صحن میں زندہ جلا دیا گیا، مسجدیں، مدرسے، چوپالیں، سرائے خانے اور مہمان خانے سب تباہی کا شکار ہوگئے۔ جب ۱۶ھ میں خلیفۂ ثانی داخل بیت المقدس ہوئے تو انتہائی امن و امان تھا، ایک آدمی کو بھی بے عزت نہیں کیا گیا، مگر یہ حیوان فطرت نصاریٰ تھے، جنہوں نے ہر طرف قہر ہی قہر ڈھایا۔ یہ حقیقت ہے کہ انا کی حاکمیت پر زمانہ میں قوموں اور ملتوں کو تباہ و برباد کرتی رہی ہیں۔

یارب اپنے خاکستر میں ایسی چنگاری بھی ہے:

پھر اسی ملبہ سے حوصلہ مند علمائے کرام نے نفسِ تازہ کے ساتھ کروٹ لی۔ علما اٹھے، قوم کے خفتہ بختوں کو بیدار کیا، علما کی دیوانگی رنگ لائی۔ اللہ رب العالمین کو ان اندرونی خلش اور چبھن پر پیار آیا اور اللہ نے یکے بعد دیگرے تین اسلام کے مردانِ کار ابطال جلیلہ افقِ شام پر نمودار ہوئے، دنیا جنہیں عماد الدین زنگی، نور الدین جنگی اور صلاح الدین ایوبیؒ کے نام سے جانتی ہیں۔

یارب زبان پر یہ کس کا نام آیا　　کہ میرے نطق نے بوسے میری زبان کے لیے

تینوں اسلام کے شیر خاصہ خاصانِ خدا تھے۔ تینوں علوم وفنون کے ماہر کامل تقوئی للّٰہیت کے علم بردار، دن کے شہسوار اور رات کے تہجد گزار حالات کو سمجھ کر عماد الدین زنگیؒ نے اپنی پوری صلاحیت عباسیوں اور سلجوقیوں سے مل کر صلیبیوں کے مقابلہ پر لگادی اور ۱۱۲۷ء میں صلیبیوں کے سامنے سدِ سکندری ثابت ہوئے۔ اور صلیبیوں کو ناکوں چنے چبوادیے۔ مسلمانوں کا کارواں عماد الدین زنگی کی قیادت میں رواں دواں تھا مگر "مادر چہ خیالیم فلک در چہ خیال" کے مصداق امتِ مسلمہ کو پھر باطنیوں کی شکل میں سینڈھ لگا اور ان بدبخت باطنی فرقہ نے صلیبیوں سے ساز باز کر کے عماد الدین زنگیؒ کو رات سوتے میں حملہ کر کے شہید کر دیا۔ إن لله وإنا إليه راجعون. خدا ان کی لحد پر رحمت افشانی کرے:

لیکن سچائی یہ ہے کہ عماد الدین زنگیؒ اپنے حصہ کا کام کر کے دنیا سے سدھار ے تھے، مگر وہ شجر طوبیٰ جس کی آبیاری انہوں نے کی تھی، وہ نور الدین زنگیؒ کی شکل میں خوب پھلا پھولا، برگ وبار لایا۔ نور الدین زنگیؒ جو اپنے والد کے سچے جانشین تھے، انہوں نے اپنے باپ سے ورثہ میں ملی بہادری وشجاعت اور حمیت وغیرت اسلامی فرزانگی کا سبق خود پڑھا تھا، فنی وحربی صلاحیتوں کو خوب صیقل کیا اور گرمایا تھا، عماد الدین زنگیؒ کی تربیت کی بھٹی میں رہ کر کندن بن کر نکھرے تھے، انہوں نے حالات کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ کن بنیادوں پر معاشرے کی تعمیر کی جانی چاہیے اور متحدہ قومی موومنٹ کس طرح باقی رکھا جا سکتا ہے، گویا وہ اقبال کی زبان میں:

سبق پڑھ شجاعت کا صداقت کا عدالت کا　　لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

نور الدین زنگیؒ نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے عیسائیوں کے دانت کھٹے کر دیے۔ بقول مؤرخین پہلا حملہ عماد الدین زنگیؒ اور دوسرا حملہ نور الدین زنگیؒ نے صلیبیوں کا ناکام بنا دیا، یہ دونوں اسلام کے مردانِ کار وہ تھے جو ہر محاذ پر عیسائیوں کو ناکام بنا رہے تھے۔

ابن اثیرؒ جو نور الدین کے عہد کے مایہ ناز مؤرخ ہیں وہ اپنی کتاب "الکامل فی التاریخ" میں لکھتے ہیں کہ "میں نے اسلام سے قبل اور اس کے بعد جتنے بادشاہوں کی زندگی کا مطالعہ کیا، مجھے خلفائے راشدین اور عمر بن عبد العزیزؒ کے بعد نور الدین جیسا اعلیٰ سیرت وکردار کا کوئی حکمراں نظر نہیں آیا"۔ (انقلاب شام: ص ۳۳)

اپنے والد کی شہادت کے بعد کل ۲۸ رسالہ سفر میں انہوں نے وہ کارنامہ انجام دیا، جو اسلامی تاریخ کا عہد زرّین کہلاتا ہے۔ ۱۱ر شوال ۵۶۹ھ مطابق ۱۵ رمئی ۱۱۷۴ء کو اسلام کا یہ بطل جلیل اپنے خدا کے دربار میں پہنچ گیا۔ إنا للّٰہ و إنا إلیہ راجعون۔

تلاطمِ خیز طوفاں سے وہ گھبرایا نہیں کرتے:

یوں تو اسلامی تاریخ اسلامی اعلیٰ کردار کے حامل انسانوں سے بھری پڑی ہیں۔ کیسے کیسے لعل و گوہر لولو و مرجان اس بحر ذخار میں پڑے ہوئے ہیں، ایسے ہی اسلام کے مردانِ کار کی فہرست میں صلاح الدین ایوبیؒ کا نام بھی روشن نظر آتا ہے جن کا نام سن کر آج بھی تثلیث کے علم برداروں کا وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر   تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

ان اسلام کے مردانِ کار حضرات کا مطمح نظر قصر سلطانی کبھی بھی نہیں رہا۔ صلاح الدین ایوبیؒ نے مصر پر ۲۴ر اور شام پر ۱۹ر سال کی مدت میں ۱۶ر سال گھوڑے کی پیٹھ پر گزارے، اسی کے ساتھ انابت الی اللہ ان کا اہم وصف تھا، ان کی شان میں اگر کلامِ اقبال سے مدد لوں تو کہا جاسکتا ہے کہ

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے   بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مؤرخین لکھتے ہیں کہ صلاح الدین ایوبیؒ نے جب خلافت سنبھالی وہ دورِ عالم کی نکبت و پستی اور ذلت کا دور تھا۔ چوں کہ اس وقت ملک شام میں دو ایسی طاقتیں تھیں جو عالمِ اسلام کے لیے بڑی دردِ سر تھی۔ مصر کی فاطمی شیعی حکومت اور دوسرے صلیبی۔ مگر ایوبی نے ان تمام کو خاک چٹادی، سلطان کی ایمانی صلابت، عبقری قیادت اور مجاہدین کی دادِ شجاعت نے عیسائیوں کی کمر توڑ دی ع

عزم و عمل سے جب بھی مسلمان نے کی سعی   ☆   رفتارِ وقت تھم گئی حالات بدل گئے

مؤرخین لکھتے ہیں کہ عسقلان بھی عکہ، ناصرہ، نابلس، طرابلس، حیفا، لپساں، یافا، بیسان، صیدا، بیروت، ہبیرون، راملہ اور دیگر ریاستوں کو فتح کرتے ہوئے صرف دو مہینوں کے اندر وہ کر دکھایا، جو تاریخ کے افق پر شاید و باید ہی نظر آتا ہے۔ تاہم ابھی سلطان کی اہم منزل ارضِ مقدس فلسطین باقی تھا، شہر القدس (یروشلم) جہاں ابھی بھی تثلیث کے علم بردار قابض تھے اور پوری قوت اس پر لگائے ہوئے تھے۔ (بالیان جو وہاں کا صلیبی حکمران تھا اس نے پوری قوت جھونک دی اور تمام علاقوں کے مفرورین یہیں آگئے تھے کہ شہر القدس کو بچانا ہے، تاہم مسلمان بھی عزم راسخ کرچکے تھے، سلطان نے آگے بڑھ کر شہر القدس کا محاصرہ کرلیا۔ ۱۲ر دن محاصرہ رہا کسی نے سامنے آنے کی ہمت نہیں کی، عیسائی صلح کے لیے آمادہ ہوگئے اور شہر القدس پر سلطانی جھنڈا بغیر قتل و قتال کے لہرادیا گیا۔ بقول مؤرخین ۲۷ر رجب ۵۸۳ھ مطابق ۱۲ر اکتوبر ۱۱۸۷ء بروز جمعہ حسن اتفاق جس شہر کو معراج کی رات کا حسین سنگم قرار دیا گیا، خدا نے ۹۱ر سال بعد پھر اس کو معراج ہی کے دن فتح سے سرفراز فرمایا، جس سے اسلامی دنیا اور خصوصاً صلاح الدین ایوبیؒ کی خوشیوں کی انتہا نہ رہی، ایسے ہی بندوں کی شان میں مرحوم اقبال گویا ہوئے۔ ع

یہ غازی یہ تیرے پُر اسرار بندے — جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے دریا و صحراء — سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

سلطان کے سامنے وہ تمام صورت موجود تھی، جو ۱۰۹۹ء میں جب ان قزاق صلیبیوں نے صلیبی فتح کی خوشیوں میں چور ہو کر القدس کے تقدس کو پامال کیا تھا، مسجد اقصیٰ کی خوب بے حرمتی کی تھی، مردوں، عورتوں اور بچوں کے ساتھ برا سلوک کیا تھا، آج سلطان چاہتے تو انتقامی کارروائی کر سکتے تھے، مگر نہیں! آج سلطان اسلام کی بجائے اس رحمتوں کا پیکر ثابت ہوئے، سلطان صرف سلطان ہی نہ تھے، بل کہ وہ خدا رسیدہ سلطان تھے۔

تاریخ کے رپورٹر بتلاتے ہیں کہ صلیبیوں نے جو حملے کیے ہیں (ان کی تعداد سات ہیں) سب سے خطرناک حملہ صلاح الدین ایوبیؒ کے دور میں ہوا جس کا جواب ایوبی نے اپنے رب کی مدد و استعانت سے بھرپور دیا۔

سقوطِ خلافت:

قارئینِ کرام! قضیہ فلسطین اور اس کی تاریخی ادوار کے ضمن میں کچھ اضافی چیزیں بھی درمیان میں آتی رہیں، چوں کہ ان چیزوں کا براہِ راست تعلق فلسطین سے تھا۔ اور سقوطِ خلافت بھی فلسطین سے مربوط ہے۔ چناں چہ مورخین لکھتے ہیں: وصال نبوی ﷺ کے بعد سے لے کر سقوطِ خلافت تک، جب تک خلافت قائم رہی دنیا میں مسلمانوں کی آب و تاب، چمک دمک باقی رہی، اسلام کا وقار بحال رہا، سقوطِ خلافت امت کے لیے پیغامِ موت ہے، شیطنت اور طاغوت کی طاقت کو بھسم کرنے اور اس پر قدغن لگانا صرف خلافت اسلامیہ ہی سے ممکن ہے۔ یہ بات یہودیت، نصرانیت اور دنیا کی غیر اسلامی قومیں اچھی طرح جانتی ہیں، پوری تاریخ میں صرف ۳ رماہ ایسے گزرے تھے کہ امت بغیر خلافت کے مرغ بسمل کی طرح تڑپتی رہی، لیکن جلد ہی ظاہر بصریؒ نے اس فریضہ کو انجام دے کر خلافت بحال کرا دی اور پھر عباسیوں نے اپنی دانائی سے ترکوں کو خلافت سونپ دی اور سلطان سلیم پہلے عثمانی خلیفہ بن گئے۔ لیکن سچائی یہ ہے کہ نصرانیت و یہودیت ہر زمانہ میں خلافت اسلامیہ کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کرتے اور منہ کی کھاتے رہے۔ تاہم ماضی میں ایک زمانہ ایسا بھی گزرا، جس میں یہودیوں نے اپنی شاطر بازیوں اور عیسائیوں اور فرق باطلہ نے اپنی منافقانہ قلابازیوں میں خلافتِ عثمانیہ ترکیہ میں سیندھ لگانے اور نقب زنی کرنے میں کامیاب ہو گئے، جو ایک بڑی درد آمیز داستانِ دلخراش ہے۔ زبان ساکت ہے، زبان ساکت ہے، قلم لڑکھڑا رہا ہے، قویٰ ہے کہ جواب دے رہے ہیں، زبان کو یارا نہیں کہ سقوطِ خلافت کا قصہ درد میں اپنی زبان سے سنا سکوں۔ جب اپنے اپنے ہی بیگانے بن کر غیروں کا کردار نبھانے لگے تو شکوہ کس سے؟ شکایت کیسی؟ سوا اس کے کیا کہا جا سکتا ہے۔ ع

کہ دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے — اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

خلافت درحقیقت امتِ محمدیہ کے اتحاد کی علامت تھی۔ اور ترکی میں اپنی ساری توانائی صرف کی جس میں وہ کامیاب رہے اور اتحاد و ترقی کے نام پر ایک تحریک چلائی، جو سچ پوچھو بے دین اور الحاد پرستوں کا ٹولہ تھا اور ان کی رگ جاں پنجۂ یہود میں تھی۔ اور اس بے دین ٹولہ نے اپنے آقاؤں کے اشارہ پر خلافت کو بشکل خلیفہ معزول کر کے ختم کر دیا۔ اس کے اثر سے پورا عالم اسلام سوگوار ہو گیا، اہل نظر پر تو گویا قیامت ہی ٹوٹ پڑی اور دین بے زار ٹولے کا سربراہ کمال اتاترک سربراہِ ملک بن کر بیٹھ گیا۔ جو یہودیوں کا اپنا منصوبہ بند پروگرام تھا اور پھر بڑی بے شرمی سے ۳/ مارچ ۱۹۲۴ء کو کمال اتاترک نے یہودیوں اور نصرانیوں کی دلی خواہش اور دیرینہ تمنا اپنی زبان سے پوری کر کے سقوطِ خلافت کا اعلان کر دیا۔ سقوطِ خلافت کیا ہوا؟ عالم اسلام تاش کے پتوں کی طرح بکھر گیا اور ایسا بکھرا کہ تادمِ تحریر ابھرنا نصیب نہ ہوا۔ خلافت کے سقوط کے بعد جیسے یہودیت اور نصرانیت کے تن مردہ میں جان آ گئی، چند مہرے عالم اسلام میں ان کے ہاتھ لگے، اتاترک محمد علی پاشا اور شریف حسین جیسے ہوس کے بندوں سے وہ سب کچھ کرایا گیا جو یہودی اور نصرانی چاہتے تھے۔ اسی کے ساتھ خلافتِ عثمانیہ کے ترکہ کی بندر بانٹ شروع ہوئی اور اسی ضمن میں برطانیہ اور فرانس نے یہودیوں کو فلسطین میں لا بٹھایا، جو تاریخ وعدہ بالفور کے نام سے جانا جاتا ہے۔ عیسائیوں نے یہودیوں کو قلب عرب فلسطین پر لا کر بٹھایا اور ایک تیر سے کئی شکار کر لیے اور جب ۱۹۲۰ء میں مسلمان اور یہودیوں کے بیچ فساد ہوا تو اس کو بہانہ بنا کر برطانیہ نے یہودیوں کے لیے کالونیاں بنا بنا کر الرٹ کر کے یہودیوں کو محفوظ کر دیا اور ہر طرح ان کی پاسبانی کرتا رہا اور ۱۴/ مئی ۱۹۴۹ء کو وہاں سے رخصت ہو گیا جو آج یہ قصہ درد بنا ہوا ہے۔

قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم:

مذکورہ بالا عبارتوں سے قارئین سمجھ گئے ہوں گے کہ دردِ سر کیسے ہوا؟ عوامل کیا پیش آئے؟ اور آج تک ان عوامل کو قابو میں نہیں کیا جا سکا، بل کہ آئے دن اس میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ اس درد کا علاج سوائے رجوع الی اللہ اور اتحادِ اسلامی کے قیام کے کچھ نہیں ہے لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

ہوس کے بندے:

مغرب نے ہمیشہ ملت فروشوں اور ہوس کے بندوں کو ڈھونڈ نکالا ہے اور ہوس کے بھکاری ہر زمانے میں ملتے رہے ہیں میر جعفروں اور میر صادقوں کی کمی نہیں، اس زمانہ میں بھی ایک ناخلف اور نابنجار شخص شریف حسین کی شکل میں ملا، جس نے ہندوستان سے لے کر حجاز تک وہ غیر شریفانہ سلوک کیا جس کا خمیازہ آج تک پورا عالم اسلام بالخصوص برصغیر ترکی، حجاز اور فلسطین بھگت رہے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ جہاں امتِ مسلمہ کی تاریخ، عقابوں اور شاہینوں کا جگر رکھنے والے جانبازوں، شیر کی دھاڑ سنانے والے جوانمردوں اور پیکر خلوص اسلام کے ابطال جلیلہ سے لبریز ہیں، وہیں ضمیر فروشوں، غداروں، سودائیوں اور ہرجائیوں عبدالدنیا و عبدالدینار کسی نہ کسی گوشہ کھڑے نظر آتے ہیں، یہ ضمیر فروشی ہی تھی، جس نے فلسطین کے لیے مصیبت کا جال پھینکا جس میں آج تک فلسطینی پھنسے ہوئے ہیں۔

حذر اے چیرہ دستاں کہ سخت ہے قدرت کی تعزیریں

ترکوں کی اسلام سے محبت حرمین شریفین کی خدمت اور دنیا بھر کے مسلمانوں سے خیر خواہی، اسی پر دنیا کے مسلمان خلافتِ عثمانیہ سے محبت کرتے تھے۔ اور انگریز سلطنت عثمانیہ سے محاذ آرا تھا، دوسری طرف جزیرۃ العرب کی قیادت سلاطین آلِ عثمان کے ہاتھوں سے جاتی رہی، تاکہ فلسطین کے اردگرد اپنے من پسند حکمراں بٹھا کر صہیونی ریاست کو تحفظ فراہم کرسکیں۔ اس لیے انگریز ہر طرح کے پلان بناتا رہا، اسی کی ایک کڑی شیخ الہند کا حجاز شریف سے گرفتار کروانا بھی ہے، اس لیے کہ اس زمانہ میں ہندوستان میں حضرت شیخ الہند محمود دیوبندیؒ انگریز کے لیے برقِ بے اماں بن کر ریشمی رومال کی تحریک شروع کرچکے تھے، جو اگر گرفتار نہ ہوتے تو کب کا انگریز کا ہندوستان میں پانچہ ہوجاتا۔ یہی وہ شریف حسین ہے جس نے آپ کو گرفتار کرواکے انگریزوں کے حوالے کیا اور پھر آپ مالٹا کی اسیری میں پہنچ گئے، مگر شریف حسین کے ہاتھ خالی اور آلِ سعود نے حجاز پر غلبہ پالیا اور نامراد بھاگا بھاگا ملک شام پہنچ گیا۔ اور اسی کی ذریات ہے، جو آج تک امتِ مسلمہ خصوصاً فلسطینیوں کے لیے دردِ سر بنی ہوئی ہے اور یہود و نصاریٰ آج تک ان کی ذریات سے کام لے رہی ہیں، مگر فلسطین آج بھی باوجود لت فرشوں کی زد میں ہونے کے، طاغوت کے مقابلے پڑتے ہوئے ہیں۔

واہ فلسطین تیری جرأت کو سلام:

آگ دخون، تباہی و بربادی ہو، گولوں، بموں، راکٹوں ٹینکوں اور اپاچی ہیلی کاپٹروں، قسم قسم کے میزائلوں اور ایف ۱۶ اور ٹرا کا طیاروں کا سامنا اور گریندوں کا گرنا تو جیسے فلسطینیوں کا رات دن کا مشغلہ ہوگیا ہے، جس فضا میں وہ سانس لے رہے ہیں، وہی ان کا دانہ پانی ہے۔ جس سے وہ پیاس بجھا رہے ہیں ان کے درد کا درماں اور زخم کا مرہم بھی گویا یہی ہے اور یہ مصائب کوئی دن دو دن، ہفتہ دو ہفتے یا مہینوں کے نہیں ہیں، بل کہ ۵۰ سالوں سے زائد کا عرصہ ہو رہا ہے۔ بے قصور فلسطینی بچے، بوڑھے، عورتیں اسی بھٹی میں جل رہے ہیں، اسی وادیٔ پُر خار میں سانس لے رہے ہیں، کوئی اور قوم ہوتی تو ریت کے ذروں کی طرح بکھر جاتی، تاش کے پتوں کی طرح منتشر ہوجاتی۔ مگر واہ فلسطین تیرے عزم و استقلال کو سلام، تیری جرأت و بیباکی کو سلام، تو نے دنیا کو سکھا دیا کہ اپنے آستھا اور عقیدے کی کس طرح حفاظت کی جاتی ہے؟ اپنے آبائی ورثہ اور اسلام کا تحفظ کس طرح کیا جاتا ہے؟ تیرے آستانہ یار سے تمسک نے دنیا کو ایک نیا رُخ، نیا رجحان اور ایک نئی سمت دی ہے۔ ان شاء اللہ یہ غموں کی طویل رات جلد ہی بدلے گی۔ ﴿ان مع العسر یسرا﴾

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب ‏ ‏ کوئی آبلہ پا وادیٔ پُر خار میں آئے

یہ غموں کی شام ختم ہوگی، یہ سیاہیوں کا ازدحام سپیدۂ سحر سے بدلے گا۔ اس لیے کہ تاریخ بتاتی ہے کہ ﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ﴾ کا دور یہود کے ساتھ ہر زمانہ میں ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ اس لیے دجالِ اکبر کے نقیب شیرون یا ہو ٹرمپ؛ اگر یہ سمجھتے ہیں کہ مادی طاقت کے بوتے پر فلسطینیوں کو دھمکایا جائے گا تو یہ خام خیالی ہے۔ حذر اے چیرہ دستاں کہ سخت ہے قدرت کی تعزیریں۔

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

شہرِ قدس، جائے وقوع:

فلسطین کسی صلاح الدین کے انتظار میں ۔از :مولانا نور عالم خلیل امینی

شہر قدس قلب فلسطین میں سطح سمندر سے تقریباً ۷۲۰۔۸۳۰ میٹر اونچے ٹیلوں پہ واقع ہے، جو شرقاً ۳۵ خط طول البلد اور شمالاً ۳۲ خط عرض البلد پہ واقع ہے۔قدس کے مشرق میں وادی قدرون واقع ہے، جو شہر کی مشرقی فصیل اور جبلِ زیتون (جبل طور) کے درمیان واقع ہے۔شہر کے مغرب میں وادی سلوان ،شمال میں جبل مشارف جنوب میں جبل مکبر ہے، جس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے تھے، جب وہ شہر قدس میں فاتحانہ تشریف لائے تھے۔

شہرِ قدس: بحرِ ابیض متوسط سے تقریباً ۳۲ میل (۵۵ کلومیٹر) کے فاصلے پر، مغرب میں، بحرِ مردار سے ۱۸ میل (۲۲ کلومیٹر) مشرق میں، نہر اردن سے تقریباً ۲۶ میل شمال میں، خلیل سے تقریباً ۱۹ میل جنوب میں، نیز سبسطیہ سے تقریباً ۳۰ میل شمال میں اور بحرِ احمر سے ۲۵۰ کلومیٹر جنوب میں واقع ہے۔

شہر قدس کے علاقے:

شہر قدس دو حصوں میں بٹا ہوا ہے:

(الف) پرانا علاقہ :یہ پرانا تاریخی علاقہ جہاں مسجد اقصیٰ واقع ہے ۔اس کا رقبہ تقریباً ایک مربع کلومیٹر ہے ۔یہ فصیل سے گھرا ہوا ہے، جس کی لمبائی تقریباً ۴ کلومیٹر اور اونچائی ۱۲ میٹر ہے ۔اس کے سات دروازے ہیں جو ہمہ وقت کھلے رہتے ہیں: باب الساہرۃ اور باب الحمید جو شمال میں واقع ہیں۔مغرب میں باب الخلیل ہے، جنوب میں باب مغاربہ اور باب داؤد ہیں، مشرق میں بابِ اسباط اور شمال مغرب میں باب حدید ہے اور مشرقی جانب ایک آٹھواں دروازہ ہے، جو ہمہ وقت بند رہتا ہے اس کو باب ذہبی (سنہرا دروازہ) کہا جاتا ہے۔

(ب) نیا علاقہ :یہ علاقہ ۱۳۸۷ھ/ ۱۹۶۷ء میں یہودیوں کے قبضے سے پہلے دو حصوں میں بٹا ہوا تھا، مشرقی حصہ اور مغربی حصہ۔اس وقت دونوں حصے مع مسجد اقصیٰ یہود کے قبضے میں ہیں۔

شہر قدس کی اسلامی فتح:

حضرتِ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے سے ہی ملکِ شام کی فتح کے لیے اسلامی افواج، علاقۂ شام کا رخ کرتی رہی تھیں؛ لیکن اللہ پاک نے اس کی فتح کی سعادت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے مقدر کر رکھی تھی؛ چناں چہ ۱۷ھ میں حضرت عمرؓ کی سرپرستی میں، حضرت ابوعبیدہ عامر بن الجراح اور خالد بن الولید رضی اللہ عنہما کی قیادت میں اُس کی فتح بہ روئے کار آئی۔

مفتوح عیسائیوں نے اسلامی فوجوں کے طویل محاصرے کے بعد یہ شرط عائد کی تھی کہ وہ بہ نفسِ نفیس حضرت امیر المومنین عمر بن الخطاب کو ہی شہر کی چابیاں سپرد کریں گے۔

دوسری شرطیں ان کی یہ تھیں کہ عیسائیوں کی مذہبی آزادی برقرار رہنی چاہیے، شہر میں واقع ان کے مذہبی مقدسات کا احترام ہونا چاہیے اور شہر میں قدیم رومی سرکلر کے مطابق یہودیوں کا داخلہ ممنوع رہنا چاہیے۔ حضرت عمرؓ نے ان کی ساری شرطیں من وعن تسلیم کرلیں، لیکن آخری شرط کہ یہودیوں کے لیے یہاں کا داخلہ اور بود و باش ممنوع ہوگی، کو حضرت عمرؓ نے مسترد کردیا۔ آپؓ نے فرمایا: کہ اللہ کی کتاب قرآنِ پاک نے اہلِ کتاب کے حقوق واجبات کی تصریح کردی ہے، اس میں اس طرح کی کوئی دفعہ ایسی نہیں جس کی رو سے بیت المقدس میں ان کا داخلہ ممنوع قرار دیا جاسکے۔ البتہ آپؓ نے ان کی یہ بات مان لی کہ ان کے گرجا گھروں اور ان کے رہائشی محلوں میں یہودیوں کی آمد قطعاً ممنوع ہوگی۔ حضرت عمرؓ نے اس وقت یزید بن معاویہ کو وہاں کا گورنر مقرر فرمایا اور انہیں حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ کے احکامات کا پابند رہنے کی تاکید کی۔ اپنی روانگی کے وقت سلامہ بن قیصر کو وہاں کا امام مقرر فرمایا۔

حضرت عمرؓ نے شہرِ قدس کی چابیاں، عیسائی پوپ اعظم "صفرانیوس" "Sophronius" سے اس حال میں وصول کیں کہ آپ سرخ اونٹ پر سوار تھے، اونٹ پر دو تھیلیاں تھیں، ایک میں ستو اور دوسرے میں کھجوریں تھیں، سامنے پانی سے بھرا ایک مشکیزہ تھا اور سواری کے پیچھے ایک توشہ دان تھا۔ آپؓ کی جلو میں جلیل القدر صحابہ کرامؓ حضرت زبیرؓ، حضرت عبادہ بن صامتؓ وغیرہما تھے۔ سفر کے دوران آپؓ باری باری اونٹ پر سوار ہوتے، کبھی آپؓ کبھی آپؓ کا خادم۔ جس وقت شہر میں داخلے کا وقت تھا، اونٹ پر آپؓ کا خادم سوار تھا۔ شہر کے نصرانیوں نے جب آپؓ کو اونٹ کی نکیل پکڑے ہوئے پیدل چلتے ہوئے دیکھا، تو انہیں یہ بہت عجیب سا محسوس ہوا، لیکن انہوں نے اس واقعہ کو اتنی اہمیت دی کہ ان کا دینی اُسقفِ اعظم "صفرانیوس" باچشمِ نم یہ کہنے لگا: "مسلمانو! تمہاری سلطنت اب قیامت تک رہے گی، کیوں کہ ظلم کی ریاست کچھ وقت کے لیے ہوسکتی ہے، لیکن عدل کی ریاست قیامت تک کے لیے ہوتی ہے"۔

عہدِ بنی امیہ میں شہرِ قدس، انتظامی طور پر بھی ملک شام کا حصہ بنادیا گیا، لیکن حضرت معاویہ نے اس کی گورنری پر سلامہ بن قیصر کو برقرار رکھا، سلامہ کا قیام ٹھیک اسی جگہ رہا جہاں عہدِ رومانی میں "ہیرودس" کا محل واقع تھا۔

عہدِ اسلامی میں، کبھی کسی یہودی کو عہدِ خلفائے راشدین وعہدِ بنی امیہ میں، قدس میں بود و باش اختیار کرنے کی ہمت نہ ہوسکی۔ عہدِ بنی امیہ میں عبدالملک بن مروان (۲۶ھ/ ۶۴۶ء-۸۶ھ/ ۷۰۵ء) جنہوں نے مسجدِ اقصیٰ کی تعمیر نو کی تھی اور ۷۲ھ/ ۶۹۱ء میں قبہ صخرہ تعمیر کرایا تھا، انھیں (یہودیوں کو) جزیہ کی ادائیگی کے بدلے، صفائی ستھرائی اور جھاڑو وغیرہ لگانے کی خدمت انجام دینے کی اجازت دے دی تھی، لیکن جب ۹۹ھ/ ۷۱۷ء میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ (۶۱ھ/ ۶۸۱ء-۱۰۱ھ/ ۷۲۰ء) سریر آرائے خلافت ہوئے، تو انہوں نے یہودیوں کی شہرِ قدس کے تعلق سے بری نیتوں کا احساس کرتے ہوئے، انھیں مسجدِ اقصیٰ میں چراغ وغیرہ کی خدمت سے، جس پر وہ مامور تھے، علاحدہ کردیے جانے کا حکم صادر فرمایا اور سارے خدامانِ حرم، مسلمان مقرر فرمائے۔

خلیفۂ اموی سلیمان بن عبدالملک (۵۴ھ/ ۶۷۴ء-۹۹ھ/ ۷۱۷ء) کو شہرِ قدس سے بڑی محبت تھی حتیٰ کہ انہوں نے اپنے برادرِ خرد کو دمشق (دارالخلافہ) میں اپنا جانشین مقرر کرکے قدس کا، نقلِ مکانی کے ارادے سے سفر فرمایا۔ ان کا ارادہ دارالخلافہ دمشق سے یہیں منتقل کرنے کا تھا؛ لیکن بہ وجوہ وہ اپنے ارادہ کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔

عہد عباسی ۲۵۷ھ/۸۷۰ء میں پاپائے روم کی اجازت کے بعد، برنارڈ نے شہر بیت المقدس کا دورہ کیا تھا اور اپنا یہ تاثر ریکارڈ کیا تھا کہ میں نے یہاں مسلمانوں اور عیسائیوں کو مکمل مفاہمت اور پرامن بقائے باہم کے اصول پر عمل کرتے ہوئے ہم سکونت پایا ہے۔ یہاں بے انتہا امن وسکون ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مسافر شب کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے پاس اُس کا شناخت نامہ ہو؛ ورنہ اس کو تاتحقیق وتفتیش جیل میں رہنا پڑے گا۔

شاہِ مصر شاہِ اخشید (۳۳۴ھ/۹۴۶ء) کے زمانے میں فارسی (ایرانی) سیّاح ناصری خسرو نے شہرِ قدس کے دورے کے بعد اپنا یہ تاثر بیان کیا تھا: یہاں بیس ہزار کی آبادی ہے، یہاں بڑے بڑے اور خوب صورت بازار ہیں، فرشِ زمین پر پتھر لگے ہوئے ہیں۔ یہاں بہت سے صلحا اور زاہدین کی قبریں ہیں۔ قابلِ ذکر ہے کہ بنی اخشید کے سارے بادشاہوں کی قدس ہی میں تدفین کی وصیت ہوا کرتی تھی؛ چناں چہ محمد الاخشید کا انتقال ۳۳۴ھ ۹۴۶ء میں دمشق میں ہوا؛ لیکن اُن کی تدفین قدس میں ہوئی۔ ۳۴۹ھ/۹۶۰ء میں انوجور بن الاخشید کی وفات ہوئی، تو انھیں بھی قدس ہی لاکر اپنے والد کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ متنبّی کے مشہور ممدوح کافور الاخشیدی بھی اپنی وفات ۳۵۷ھ/۹۶۷ء کے بعد، قدس ہی میں مدفون ہوئے۔ مشہور مؤرخ وسیاح "اصطخری" (متوفی ۳۴۶ھ/۹۵۷ء) نے اخشیدیوں کے دور میں قدس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہاں اتنی بڑی مسجد تھی کہ اس دور میں پورے عالم اسلام میں اس سے بڑی مسجد نہ تھی؛ لیکن وہاں کچھ چشموں کے سوا جو کھیتی کی سینچائی کے لیے ناکافی تھے آب رواں کا کوئی نظم نہ تھا۔ قدس کے پہاڑی اور میدانی علاقوں میں زیتون، انجیر، انگور، گولر اور ہر طرح کے پھل کی کاشت ہوتی ہے۔

۳۵۸ھ/۹۶۹ء میں مصر وشام پر فاطمیوں کا تسلط ہوگیا، چناں چہ قدس بھی معز الدین اللہ الفاطمی (۳۱۹ھ/۹۳۱ء - ۳۶۵ھ/۹۷۵ء) کے زیر تسلط آگیا۔ معز کی، اہل کتاب اقلیتوں، بالخصوص یہودیوں سے ہمدردی کے حوالے سے بڑی شہرت تھی۔ فاطمیوں نے قدس میں بہت سی عمارتیں تعمیر کیں، مسجد اقصیٰ کی توسیع بھی کی، زلزلے کے نتیجے میں اس میں جو شگافیں پڑگئی تھیں، ان کی اصلاح ومرمت بھی کی، قدس میں فاطمیوں کے دور کی اہم یادگاروں میں سے مشہور "بیمارستان" ہسپتال تھا۔ یہ یہاں کا پہلا شفاخانہ تھا، اس پر فیاضی سے مال وزر صرف کیا جاتا تھا۔ یہاں کے اطبا کو بالمقطع تنخواہیں ملا کرتی تھیں۔ فاطمیوں نے یہاں ایک "دارالعلم" بھی قائم کیا تھا، جو قاہرہ میں ۳۹۵ھ/۱۰۰۴ء میں تعمیر کیے گئے "دارالحکمت" کی شاخ تھا۔

مشہور مؤرخ وسیاح مقدسی (شمس الدین متوفی تقریباً ۳۸۰ھ/۹۹۰ء) نے بیت المقدس کے تذکرہ میں لکھا ہے: اس بڑے علاقہ کے شہروں میں قدس سے بڑا کوئی شہر نہیں، یہاں سردی اور گرمی زیادہ نہیں ہوتی، برف باری بھی شاید و باید ہی ہوتی ہے، اس طرح کا موسم جنت کا ہوگا۔ یہاں عمارتیں پتھروں کی ہیں، ان عمارتوں سے زیادہ خوب صورت اور مضبوط عمارت میں نے کہیں نہیں دیکھی؟ یہاں کے باشندے انتہائی پاک طینت اور یہاں کی زندگی انتہائی خوش گوار ہے، یہاں کے بازاروں سے زیادہ صاف ستھرے بازار شاید و باید کہیں ہوں گے، نہ یہاں سے بڑی مسجدیں ہوں گی، نہ یہاں سے زیادہ مقدسات کہیں ملیں گے۔

۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء میں یہاں سلجوقیوں کا تسلط ہو گیا، جب سلجوقی بادشاہ الب ارسلان (متوفی ۴۶۴ھ/۱۰۷۲ء) نے اس کو فاطمیوں سے چھین لیا۔ پھر سلجوقی بادشاہ ملک شاہ بن الب ارسلان (۴۴۷ھ/۱۰۵۵:۴۸۵ھ/۱۰۹۲ء) کے ترکمانی غلام اُرتُق بن اَکسِب نے ۴۷۰ھ/۱۰۷۷ء میں بزور تلوار بیت المقدس کو ہتھیا کر وہاں ارتقیوں کی ریاست قائم کر لی۔

سلجوقیوں اور فاطمیوں کی رسا کشی جاری تھی کہ صلیبیوں نے قدس پر حملے کی تیاری شروع کر دی؛ چناں چہ ۴۹۳ھ/۱۰۹۹ء میں انہوں نے قدس پر، فرانس کے ''لورین'' صوبے کے گورنر ''گوڈوری ڈی بویان'' کی قیادت میں حملہ اور قبضہ کر لیا۔ شہر قدس کے سارے مسلمانوں اور یہودیوں کا قتل عام کیا، ان کے مکانوں اور مقدسات کو جلا کر خاکستر کر دیا اور یہاں داخلے پر ان کے لیے مکمل پابند عائد کر دی، تقریباً ۸۸ رسال تک شہر قدس صلیبیوں کے قبضہ میں رہا، کئی صلیبی بادشاہوں نے یہاں حکومت کی۔ اسی وقت صلیبیوں کی دو متشدد اور حقیقی معنی میں ''دہشت گرد'' گروہ معرضِ وجود آئے۔ ایک گروہ ''شہسواران ہیکل'' (Team Pliers) اور دوسرا گروہ ''شہسواران قدیس یوحنا'' (Hospitalies) کے نام سے جانا گیا۔ اول الذکر ۵۱۲ھ/۱۱۱۸ء میں جب کہ ثانی الذکر ۵۰۷ھ/۱۱۱۳ء میں ظہور پذیر ہوا۔ پہلے گروہ کا کام مسلمانوں کا صفایا اور ان کا نام ونشان مٹانا تھا، جب کہ دوسرے گروہ کا کام شروع شروع میں بادی النظر میں عیسائی بیماروں کی دیکھ ریکھ تھا؛ لیکن اسلام کے پر سوز قائد صلاح الدین ایوبیؒ (۵۲۱ھ/۱۱۳۸ء:۵۸۹ھ/۱۱۹۳ء) کے حملوں کے بعد، یہ دونوں صلیبی جماعتیں بہ جلد خالص عسکری بن گئیں، دونوں نے مسجد اقصیٰ کی سرگرمیوں کا اور اپنے اسلحوں کے لیے ذخیرہ گاہ بنالیا۔

لائق ذکر ہے کہ قدس پر صلیبیوں کے قبضے ۴۹۳ھ/۱۰۹۹ء کے بعد سے ہی مسلمانوں نے برابر اس کی مزاحمت جاری رکھی اور کبھی چین سے نہیں بیٹھے۔ معرکہ حطین ۵۸۳ھ/۱۱۸۷ء سے فارغ ہوتے ہی شیر اسلام صلاح الدین ایوبیؒ نے شہر قدس کا محاصرہ کر لیا، صلیبیوں کے لیے خود سپردگی کے سوا کوئی چارہ نہ رہا، چناں چہ جزیے کی ادائیگی کے عوض صلاح الدین نے خود سپردگی کو تسلیم کر لیا اور انہیں جزیے کی ادائیگی کے لیے ۴۰ دن کی مہلت دی۔

شاہ فرانس ''لوئیس ۹'' (Louis9) کی قیادت میں کیے گئے مسلسل صلیبی حملوں کی زبردست اور موثر مزاحمت کرتے ہوئے ۶۴۶ھ/۱۲۴۸ء میں ایوبی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا اور اس کی جانشیں سلطنت مملوکی ہوئی، جس نے صلیبیوں سے زبردست ٹکر لیتے ہوئے شہر قدس کی پوری پوری حفاظت کی اور مسلسل جنگوں کی وجہ سے پیدا شدہ تباہیوں کا ازالہ کیا، مسجد اقصیٰ کی مکمل اصلاح ومرمت کی، شہر قدس میں بہت سی عالیشان عمارتیں تعمیر کیں۔ سلطان ظاہر بیبرس (۶۲۵ھ/۱۲۲۸ء۔ ۶۷۶ھ/۱۲۷۷ء) جنہوں نے صلیبی جنگ کے قائد لوئیس ۹'' (۶۱۱ھ/۱۲۱۴ء۔ ۶۶۸ھ/۱۲۷۰ء) کو گرفتار کر کے ہمیشہ کے لیے صلیبی جنگ کا باب بند کر دیا ۶۶۱ھ/۱۲۶۲ء اور ۶۶۳ھ/۱۲۶۵ء میں دوبارہ بیت المقدس کا بہ ذات خود دورہ کیا اور وہاں شرعی علوم کی تعلیم کے لیے ایک دار الحدیث اور مدرسہ ابا صیریہ قائم کیا، قبۃ الصخرۃ کی منہدم شدہ عمارت کو دوبارہ تعمیر کیا۔ اسی سلطنت مملوکی کے ہنرمند بادشاہ سلطان منصور سیف الدین قلاوون (۶۲۲ھ/۱۲۶۸ء۔ ۶۹۳ھ/۱۲۹۴ء) نے ۶۷۹ھ/۱۲۸۰ء میں بیت المقدس میں رباط قلاوون، مسجد قلندری، قبۃ الملکیہ اور ان کے علاوہ بہت سی یادگار اور شاندار عمارتیں بنوائیں۔

مملوکی سلطنت کے دور میں ہی، ہمیشہ کے لیے بیت المقدس صلیبیوں سے پاک ہو گیا، بل کہ ملک شام سے ہی ان کا صفایا ہو گیا، چناں چہ مذکورہ شاہ اشرف خلیل بن قلاوون اور فرنگیوں کے مابین ''عکا'' شہر میں ۶۸۲ھ/ ۱۲۸۳ء میں مشہور تاریخی معاہدہ زیرِ عمل آیا جس کے نافذ العمل اور موٴثر رہنے کی مدت اس وقت دس سال دس ماہ دس دن اور دس گھنٹے متعین کی گئی تھی اور جس میں صلیبیوں نے یہ وعدہ کیا تھا کہ شاہ خلیل ہی کا بہ شمول شہر بیت المقدس سارے حجاز و مصر و شام و اردن و فلسطین پر اقتدار رہے گا۔ مملوکیوں کے دونوں دھڑوں بحریہ و شراکسہ کے پورے دور میں بیت المقدس ان کے لیے خاصا مرکزِ توجہ رہا۔ وہاں انھوں نے دینی، اجتماعی اور بری و بحری پروجکٹس برپا کیے۔ ان میں سے بہت سے نقوش ہنوز تابندہ ہیں۔

سلطان سلیم اول عثمانی (۸۷۰ھ/ ۱۴۶۶ء-۹۲۶ھ/ ۱۵۲۰ء) (جو نویں عثمانی سلطان تھے اور خلفائے عثمانی میں پہلے شخص تھے جنہیں ''امیر المومنین'' کے لقب سے نوازا گیا) کے ہاتھوں ۹۲۳ھ/ ۱۵۱۷ء میں سلطنت مملوکی کا خاتمہ ہو گیا، انہوں نے مصر و شام پر قبضہ کر لیا۔ چوں کہ قدس شام کے ماتحت تھا، اس لیے یہ بھی انہیں کے زیرِ نگیں آ گیا۔ انہوں نے بیت المقدس میں ہی عثمانی سلطنت کا ملکِ شام کے لیے نائب مقرر کر دیا۔ ان کا ایک کارنامہ موٴرخین یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے فلسطین و سینا کی طرف یہودیوں کی آمد کو باقاعدہ فرمان کے ذریعے روک دیا تھا۔

عہدِ عثمانی میں شہر قدس ایک بڑی انتظامی اکائی کی حیثیت رکھتا تھا اور ''متحق القدس'' کے نام سے مشہور تھا۔ اس کے ماتحت پانچ سیکٹر تھے جو قضاءِ قدس، قضاءِ یافا، قضاء الخلیل، قضاءِ غزہ اور قضاءِ بئر السبع کے نام سے معروف تھے۔ نیز اس شہر کو دس انتظامی گوشوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ہر سیکٹر کا منتظم ''قائم مقام'' کہلاتا تھا۔ شہر قدس کے جج کی عثمانی دور میں بڑی اہمیت ہوا کرتی تھی، کیوں کہ شہر کی انتظامی اکائیوں کا ارتکاز اسی کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ لائقِ ذکر ہے کہ سارے یا اکثر حکومتی ملازمین و اہل کار، شہر قدس کے باسی ہوتے تھے۔ یہاں ایک مجلس شوریٰ اور ایک مجلس عمومی بھی ہوتی تھی۔ عثمانی پارلیامنٹ میں ۱۹۰۸ء میں شہر قدس کے ۳ ارکان ہوتے تھے: ۲ خاص شہر قدس کے اور ایک ''یافا'' کا ہوا کرتا تھا۔

۱۳۳۳ھ/ ۱۹۱۴ء میں عثمانی سلطنت کی جنگ عظیم میں ہزیمت کے بعد ۱۳۳۶ھ/ ۱۹۱۷ء میں بیت المقدس انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا۔ (إتحاف الأخصا بفضائل المسجد الأقصى)

برطانوی اقتدار کی دور میں نہ صرف بیت المقدس بل کہ پورے فلسطین کو یہودیوں کے حوالے کر دیے جانے کی کارروائی قدم بہ قدم جاری رہی۔ انگریزوں نے یہاں یہودیوں کی پوزیشن مضبوط کر کے مسلمانوں کو بے دست و پا کر دینے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی، سوائے شہر کے اُس حصے کے جو شہر پناہ کے اندر تھا اور سوائے چند متصل قریوں کے، کہ یہ فلسطین پر برطانوی اقتدار کے بعد بھی تقریباً ۱۹ر برس تک اردن کے تصرف میں رہے۔

۱۳۶۸ھ/ ۱۹۴۸ء میں عربی یہودی جنگ کے نتیجے میں، یہودیوں نے بیت المقدس کے ۶۶،۲ فیصد رقبے پر قبضہ کر لیا؛ لیکن پرانا شہر، اب بھی مسلمانوں کے قبضے میں رہا؛ لیکن فلسطین کے دگر باقی ماندہ حصوں کی طرح یہ باقی ماندہ اہم علاقے بھی ۱۳۸۷ھ/ ۱۹۶۷ء میں یہودیوں کے قبضے میں چلے گئے۔

بیت المقدس و مسجد اقصیٰ، نئے تصورات واصطلاحات:

فلسطین کسی صلاح الدین کے انتظار میں ۔از: مولانا نور عالم خلیل امینی

۱۳۳۵ھ/ ۱۹۱۷ء میں بھی جب سلطنت عثمانیہ کی جنگ عظیم میں شکست کے بعد فلسطین پر عارضی برطانوی اقتدار قائم ہونے کو تھا شہر قدس ایک ہی شہر ،جو دسویں سلطان عثمانی شاہ سلیمان قانونی (۹۰۰ھ/ ۱۴۹۵ء۔ ۹۷۳ھ/ ۱۵۶۶ء) کی دسویں صدی ہجری کے وسط میں تعمیر کردہ فصیل سے گھرا ہوا تھا،جس میں شہر پناہ سے باہر کے چند محلے بھی شامل تھے، جو سلطنت عثمانیہ کے دور میں شمالی،مشرقی اور جنوبی سمتوں میں معرض وجود میں آئے تھے لیکن برطانوی قبضے کے دوران یہودی نمایندوں نے بلدیاتی حدود سے چھیڑ چھاڑ کی ،چناں چہ سمت مغرب میں جدھر یہودیوں کی گھنیری آبادیاں تھیں، کئی کلو میٹر تک شہر کی حدیں بڑھادی گئیں،جب کہ سمت جنوب و مشرق میں جدھر عربوں کی آبادیاں تھیں ،صرف چند میٹروں تک ہی بلدیاتی خط کھینچا جاسکا، چناں چہ کئی بڑے بڑے عربی گاؤں شہر کی حدود میں شمول کے استحقاق کے باوجود سہولتوں سے محروم کرنے کے لیے بلدیاتی دائرے میں نہیں آنے دیے گئے ان مواضعات میں طور، دیر یاسین، سلوان، عیسویہ، مالحہ، بیت صفا، شعفاط بلفتا اور عین کارم شامل ہیں۔اس ظالمانہ امتیازی عمل کی وجہ سے شہر قدس، ایک متحدہ عربی اور مسلمان شہر کی بہ جائے کئی شہر نظر آنے لگا۔

<u>قدس قدیم:</u> یا قدس عتیق، جو سلیمان قانونی کی تعمیر کردہ شہر پناہ کے اندر ہے اور جس کا رقبہ ۰.۹ مربع کلو میٹر ہے اور جو چار پہاڑوں پہ واقع ہے: جبل موریا، جبل صہیون، جبل آکرا اور جبل بزیتا۔ مسجد اقصیٰ قدیم شہر قدس کے جنوب مشرق حصے میں جبل موریا پہ واقع ہے۔

<u>قدس مشرقی:</u> یہ قدس قدیم ہی ہے، جس میں بیرون فصیل مسلمانوں کے بسائے ہوئے محلے شامل ہیں، جیسے حی الشیخ جراح، حی باب الساہرۃ، حی وادی الجوز۔ مشرقی قدس کی اصطلاح، صہیونی ریاست کے قیام سے پہلے مسلمانوں اور یہودیوں کے مابین کشیدگی میں اضافے کے بعد، سامنے آئی تھی، کیوں کہ مسلمان بڑی اکثریت کے ساتھ شہر کے مشرق میں اور یہودی غالب اکثریت کے ساتھ شہر کے مغربی حصے میں مرتکز ہوگئے تھے،لہٰذا مشرقی حصے کو، قدس شرقی اور مغربی حصے کو قدس غربی کہا جانے لگا۔

<u>قدس غربی:</u> یہ نیا قدس شہر، برطانوی اقتدار کے دور میں معرض وجود میں آیا، یہاں دنیا کے مختلف خطوں سے آنے والے یہودی آکر بستے رہے، یہ بری طرح پھیلتا گیا۔ ۱۳۶۵ھ/ ۱۹۴۶ء میں اس کو برطانوی استعمار نے قدس کی بلدیاتی حدود میں شامل کر لیا تھا، چناں چہ قدس کا کل رقبہ ۱۹۰۰۰ مربع کلو میٹر ہوگیا تھا یعنی پرانے قدس سے ۲۰ گنا زیادہ۔

متحدہ قدس: یہ یہودیوں کی ایجاد کردہ اصطلاح ہے، جس کو وہ دونوں حصوں مشرقی اور مغربی پر اطلاق کرنے کے لیے بولا کرتے ہیں۔ ۱۳۶۷ھ/ ۱۹۴۸ء میں جیسا کہ بار بار کہا گیا شہر قدس عملی طور پر دو حصوں مشرقی عربی اور مغربی یہودی میں تقسیم ہو گیا تھا ۲۸ ربیع الاول ۱۳۸۷ھ/ ۷ جون ۱۹۶۷ء کو اسرائیل نے سارے قدس پر قبضہ کر لیا اس کے بعد سے ان کا اصرار رہا اور ہے کہ متحدہ قدس اسرائیل کا ابدی دار الحکومت ہے۔

گریٹر قدس: یہ وہ وسیع تر قدس کا تصور ہے، جس کو برپا کر کے صہیونی شہر کو یہودی شناخت دے کر اس کی اسلامی عربی پہچان کو ختم کرنے کے درپے ہیں، ان کا ارادہ ہے کہ عظیم تر قدس میں یہودی کی ایسی بھاری اکثریت ہو جائے کہ مسلمان انتہائی چھوٹی سی اقلیت بن جائیں۔ ان کا مقصد یہ بھی ہے کہ مسلم عربی محلوں کو یہودی آبادیوں سے اس طرح گھیر دیا جائے اور بیرون فصیل واقع عربی محلوں سے علاحدہ کر دیا جائے کہ عربوں کے لیے شہر کے اندر زندگی دشوار تر بل کہ خارج از امکان ہو جائیں اور بالآخر ان کی اسلامی عربی شناخت تحلیل ہو جائیں یا وہ از خود یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلے جائیں۔

مسجد اقصیٰ:

شہر قدس کے فصیل کے علاوہ شہر کے اندر اور ایک فصیل ہے، جو مسجد اقصیٰ کے گرد جبل موریا پے واقع ہے اس فصیل کا مغربی گوشہ ۴۹۰ میٹر مشرقی گوشہ ۴۷۴ میٹر، شمالی گوشہ ۳۲۱ میٹر اور جنوبی حصہ ۲۸۳ میٹر ہے، حرم قدس کے فصیل بند دائرے میں کئی ایک اسلامی عمارتیں اور مقدسات ہیں جن میں مشہور قبۃ الصخرۃ ہے۔ جب مسجد اقصیٰ کا لفظ بولا جاتا تھا تو سلف کے نزدیک فصیل بند سارا حرم مراد ہوتا تھا لہٰذا مسجد قبۃ الصخرۃ حرم اقصیٰ کا حصہ ہے۔ اسی طرح مسجد عمر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فتح کے وقت تعمیر کی تھی اور جس کی تعمیر نو عبد الملک بن مروان نے کی تھی مسجد اقصیٰ ہی کا حصہ ہے۔

مسجد اقصیٰ کے نقشے پر ایک نظر:

مسجد اقصیٰ: یہ وہ سارا حرم ہے جو فصیل بند دائرے میں واقع ہے۔ اسی میں مسجد قبۃ الصخرۃ بھی آتی ہے، جس کا گنبد سنہرا ہے اور جو حرم اقصیٰ کے گویا قلب میں آتی ہے اسی طرح سیاہ مائل بہ سرمئی گنبد والا مصلائے قبلہ ہے، جو جانب قبلہ مسجد اقصیٰ کے بالکل جنوب میں واقع ہے۔ اس کے علاوہ تقریباً ۲۰۰ اسلامی مقدسات و نقوش اسی کے اندر آتے ہیں، جن میں مسجدیں، عمارتیں، گنبد، پانی کی سبیلیں، پانی کے پرنالے، گیلریاں، مدرسے، درخت، محرابیں، منبر، منارے، دروازے، کنوئیں اور لائبریریاں داخل ہیں۔

رقبہ: مسجد اقصیٰ کا کل رقبہ ۱۴۴۰۰۰ مربع میٹر ہے، اس طرح یہ رقبہ فصیل بند شہر قدس کا چھٹا حصہ ہے۔ یہ رقبہ غیر مربوط گوشوں پر مشتمل ہے چناں چہ مغربی گوشے کی لمبائی ۴۹۱ میٹر مشرقی گوشے کی لمبائی ۴۶۲ میٹر شمالی گوشے کی لمبائی ۳۱۰ میٹر اور جنوبی گوشے کی لمبائی ۲۸۱ میٹر ہے۔ اس رقبے میں جب سے مسجد بنی ہے، کوئی کمی زیادتی واقع نہیں ہوئی جب کہ مسجد حرام مکہ مکرمہ اور مسجد نبوی مدینہ منورہ میں بار بار ترمیم و توسیع ہوتی رہی ہے۔

موجودہ صورت حال: باوجود ے کہ مسجد اقصیٰ کا انتظام و انصرام اردنی وزارت اوقاف و امور مقدسات اسلامیہ کے ماتحت انجام پذیر ہوتا ہے، لیکن مسجد اقصیٰ جیسا کہ معلوم ہے، اس وقت اسیر قبضۂ یہود ہے، اس کی آمد و رفت کی راہیں صہیونی قبضے کے دائرے میں آتی ہیں یہ قبضہ ۱۹۶۷ء سے قائم ہے۔ صہیونی حکومت غیر اعلانیہ طور پر یہودیوں کے دعوں کی موید اور برپا ہونے کی راہ کے کانٹوں کو ایک ایک کر کے چننے میں لگی ہوئی ہے، یہودیوں کا بے بنیاد عقیدہ ہے کہ مسجد اقصیٰ ہیکل سلیمانی کے ملبے پہ واقع ہے، شہر قدس کے بغیر ریاست اسرائیل بے معنی ہے اور ہیکل کے بغیر شہر قدس بے معنی ہے (بن گوریون وزیراعظم اول ریاست یہود)

مسجد اقصیٰ کا انہدام یہودیوں کا بڑا ہدف ہے۔ اس سلسلے میں یہودیوں نے کئی طرح کی خطرناک کارروائیاں کرلی ہیں اور باقی ماندہ پروگراموں کو برپا کرنے کے لیے سنجیدگی سے درپے ہیں انہوں نے مسجد اقصیٰ کی مغربی دیوار کے ایک حصے کو علاحدہ کرکے "دیوار گریہ" نام دے کر مسلمانوں کو اس کے نزدیک جانے سے بھی روک دیا ہے، مسجد اقصیٰ کو جلانے، گرانے اس کو دھماکے سے اڑا دینے کی کئی کارروائیاں وہ کھلے عام کر چکے ہیں، اس کے علاوہ انہوں نے مسجد اقصیٰ کے نیچے سرنگیں کھود ڈالی ہیں؛ اور کسی نہ کسی بہانے سے کھدائی کا کام وہ کرتے ہی رہتے ہیں، جس کی وجہ سے مسجد اقصیٰ کے بہت سے حصوں میں دراڑیں پڑ گئی ہیں، نماز کے لیے مسجد میں مسلمانوں کی آمد و رفت بھی آزادانہ نہیں ہو پاتی ہیں، مسجد کی دیکھ ریکھ، اصلاح و مرمت پر بھی طرح طرح کی پابندیاں عائد ہیں، بار بار مسجد اقصیٰ پر اسرائیلی فوجوں اور صیہونی دہشت گردوں کے ذریعہ دھاوا بولنے اور مسلم نوجوانوں کو زد و کوب کرنے اور انہیں گرفتار کرنے کی کارروائی ہوتی رہتی ہے۔

مسجد اقصیٰ کے عناصر:

بہت سے مسلمان گول سنہرے گنبد والی عمارت کو ہی مسجد اقصیٰ سمجھ بیٹھتے ہیں، مسجد اقصیٰ در حقیقت ایک احاطہ ہے، جس کے اندر عمارتیں، مدرسے، مسجدیں، پرنالے، گنبد، گیلریاں اور محرابیں وغیرہ ہیں، اور یہ سارا کچھ مسجد اقصیٰ ہی سے عبارت ہے۔

مسجد اقصیٰ کی عمارت: یہ مسجد اقصیٰ نہیں؛ بل کہ اس کو مجازاً مسجد اقصیٰ کہا جاتا ہے۔ پہلے اس کو جامع مسجد اور مسجد رجال (مسجد مرداں) کہا جاتا تھا، یہ موجودہ عمارت خلیفہ اموی عبدالملک بن مروان کے دور میں بنی تھی۔ اسی طرح قبۃ الصخرۃ کے عمارت بھی مسجد اقصیٰ نہیں؛ بل کہ مسجد اقصیٰ مذکورہ ساری چیزوں سے عبارت ہے اور سب کی جامع ہے، نہ صرف مذکورہ دونوں عمارتیں بل کہ دیگر سیکڑوں تاریخی اسلامی آثار و نقوش پر بھی مسجد اقصیٰ ہی کا اطلاق ہوتا ہے، مسجد اقصیٰ کی بیچ والی گیلری کے نیچے قدیم مسجد اقصیٰ واقع ہے، جس کی تحریک اسلامی نے اصلاح و مرمت کرائی تھی بل کہ یہ دسیوں سالوں سے بند پڑی تھی۔

مسجد اقصیٰ جنوب مشرقی گوشہ: مسجد کے احاطہ میں یہ سب سے بلند حصہ ہے، یہ مسجد اقصیٰ کے جنوب مشرقی حصے کی آخری حد ہے۔

مروانی مصلیٰ: شیخ رائد صلاح: (مقبوضہ فلسطینی تحریک اسلامی کے سربراہ) کی صدارت میں اسلامی تحریک میں اس کی اصلاح و مرمت کرائی تھی اور اس میں ٹائلس لگوائے تھے ۱۴۱۹ھ/۱۹۹۸ء میں نماز کے لیے اس کا افتتاح ہوا تھا، سیکڑوں سال بعد مسجد اقصیٰ میں روبہ عمل آنے والا، یہ سب سے بڑا تعمیری منصوبہ تھا یہودیوں نے مصلیٰ مروانی کو اپنے زیر قبضہ لینے کی کوشش کی تھی، یہاں اپنا ہیکل بنا کر اس کو اپنے مزعومہ ہیکل سلیمانی کے لیے دروازہ بناڈالنے کا ان کا ارادہ رہا ہے، مسلمانوں کی طرف سے اس کی صفائی ستھرائی اور ترمیم و اصلاح کے بعد وہاں نماز کی ادائیگی کی ابتداء سے ان کا منصوبہ سرد ست کھٹائی میں پڑ گیا ہے، اریل شیرون نے (۲۸ ستمبر ۲۰۰۰ء، جمعرات ۲۷ جمادی الاخریٰ ۱۴۲۱ھ) کو جو مسجد اقصیٰ کو اپنے قدموں سے ناپاک کرنے کی اشتعال انگیزانہ کارروائی کی تھی، اس کا مقصد درحقیقت مصلیٰ مروانی کا درشن کرنا تھا۔

مصلیٰ مروانی کا راستہ: اس جگہ اسلامی تحریک نے کھود کر مصلیٰ مروانی کی سات گیلریاں دریافت کی تھیں۔ یہاں سے ہزاروں ٹن مٹی صاف کی گئی اور اس بڑے مصلی کے شایان شان، ایک بڑی راہ تعمیر کی گئی۔

قبہ صخرۃ: بہت سے مسلمان اس کو مسجد اقصیٰ باور کر لیتے ہیں۔ حال آں کہ مسجد اقصیٰ کے احاطے میں جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا۔ واقع ساری چیزیں مسجد اقصیٰ ہیں، یہ اس کا ایک جزو ضرور ہے، قبہ صخرۃ ان چیزوں۔ آثار و عمارت میں سے ایک ہے، جن کے مجموعے کا نام مسجد اقصیٰ ہے۔ قبہ صخرہ خلیفہ اموی عبدالملک بن مروان کے زمانے میں تعمیر کیا گیا تھا، جنھوں نے مصر کے خراج کی پوری رقم کو سات سال تک صرف اسی پر خرچ کیا۔ یہ عمارت اس صخرۂ مشرفہ کو محیط ہے، جس پر سے شب معراج میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا سے آسمانوں کی طرف صعود ہوا تھا۔

اموی محلات: یہ اموی محلات کے آثار ہیں، یہودیوں نے مسجد اقصیٰ کی طرف ان کے نیچے کھدائی کی ہے۔ ۱۴۲۰ھ/ ۱۹۹۹ء میں صہیونی وزیر اعظم یہود باراک کی حکومت نے مصلیٰ مروانی کی دیوار تک ایک راہ داری تعمیر کرائی۔ یہی دیوار مسجد اقصیٰ کی جنوبی حد ہے۔ باراک نے بہ ذات خود اس کا افتتاح کرتے ہوئے یہ کہا کہ ہمارے ہیکل سلیمانی کا یہی دروازہ ہے۔

گوشہ ختنیہ: یہ مسجد اقصیٰ کا آخری جنوبی حصہ ہے۔ یہیں سے خلفا و امرا اپنے محلات سے مسجد اقصیٰ آیا کرتے تھے۔

گوشۂ جنوب مغربی: یہ مسجد اقصیٰ کی آخری جنوب مغربی حد ہے۔

دعوت و اصول دین کالج: یہ جنوبی سمت میں مسجد اقصیٰ کی ایک عمارت ہے۔ یہ ماضی میں بھی ایک مدرسے کے طور پر مستعمل رہی تھی۔ ۱۴۱۴ھ/۱۹۹۳ء تک یہ دعوت و اصول دین کالج رہا تھا۔ اب یہ مسجد اقصیٰ کی لائبریری کے بہ طور مستعمل ہے۔ صہیونی حکام نے انتفاضہ اولیٰ (۱۳/۸/ ۱۹۸۷ء/ ۴/۳/ ۱۹۸۸ء) کے وقت اس عمارت کو بند کر دیا تھا۔

اسلامی میوزیم: یہ بہت پرانی عمارت ہے، اس وقت اس میں اسلامی میوزیم ہے۔ بیت المقدس پر اسلامی حکم رانی کے مختلف ادوار کے بہت سے آثار یہاں محفوظ ہیں۔ یہیں نورالدین زنگی (متوفی ۵۷۰ھ/۱۱۷۴ء) کے منبر کی باقیات بھی ہیں۔ جس کو اگست ۱۹۶۹ء میں آسٹریلیائی صیہونی دہشت گرد "مائیکل روہان" نے جلا دیا تھا۔

بوابہ مغاربہ: یہ دروازہ، مسجد اقصیٰ کی مغربی سمت میں دیوار براق کے بالمقابل واقع ہے، اسی دیوار کو یہودی بے بنیاد طور پر "دیوار گریہ" کہتے ہیں۔ یہ دروازہ اسی مغاربہ محلے سے مسجد اقصیٰ میں آنے کی واحد راہ تھا۔ مغاربہ محلے کو یہودیوں نے قبضے کے بعد نیست و نابود کر دیا، مسلمانوں کو قتل کر دیا اور باقی ماندہ کو در بہ در کر دیا اسی کے ملبے پر آج یہاں حارۂ یہود (محلہ یہود) قائم ہے ۱۶/ ربیع الآخر ۱۴۱۱ھ۔ ۸/۱۰/۱۹۹۰ء کو مسجد اقصیٰ میں یہودیوں نے جو قتل عام کیا تھا، اس کے بعد مسلمانوں کے لیے اس دروازے کو یہ کہہ کر بند کر دیا کہ دیوار گریہ کے پاس جو یہودی عبادت کو آتے ہیں، ان کے لیے مسلمانوں کے اس دروازے سے مسجد میں آنے جانے کی شکل میں بڑا خطرہ رہے گا۔ قابل ذکر ہے کہ مسجد اقصیٰ میں یہودی پولیس، اسی راہ سے بار بار ہلہ بولتی رہتی ہے۔

دیوار براق: اسی جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شب اسراء و معراج میں اپنی براق سواری کو باندھا تھا۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لے گئے تھے، اسی کو صیہونی بلا دلیل "دیوار گریہ" کہتے ہیں، کہ یہ ان کے مزعومہ ہیکل سلیمانی کی آخری نشانی اور باقیات ہے۔ اس کے میدان میں ان کی میزیں وغیرہ پڑی رہتی ہیں۔

دروازہ سلسلہ: بازار کی طرف کو جانے والا یہ مسجد اقصیٰ کا ایک بڑا دروازہ ہے، اسی کے نیچے سے یہودیوں کی کھودی ہوئی "حشمونائیم" نام کی سرنگ دیوار براق کی جنوبی سمت سے مسجد اقصیٰ کی شمال مغربی سمت تک جاتی ہے۔

مدرسہ عمریہ: یہ مدرسہ، مسجد اقصیٰ میں شمالی جانب ہے، یہ مسجد اقصیٰ کا جزو لاینفک ہے۔ یہودی اس پر بھی قبضہ کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ وہ یہاں اپنی عبادت گاہ بنانا چاہتے ہیں۔

شمال مغربی حد: یہ مسلمانوں کے محلے میں واقع ہے۔

شمالی مشرقی حد: یہ اسباط دروازے کے پہلو میں ہے۔

دروازۂ اسباط: یہ مسجد اقصیٰ کی شمالی سمت میں واقع ہے۔ اس وقت یہ مسلمانوں کی آمد و رفت کا بنیادی دروازہ ہے، بالخصوص باب مغاربہ کے بند کر دیے جانے کے بعد، نمازی یہیں سے آتے جاتے ہیں۔ بسیں اور دیگر گاڑیاں بھی یہیں سے آتی جاتی ہیں۔

باب رحمت: یہ مسجد اقصیٰ کے دروازوں میں سے ایک ہے۔ صلاح الدین ایوبیؒ نے اس کو بند کر دیا تھا، کیوں کہ اس وقت اس دروازے سے صلیبیوں کے دھاوا بول دینے کا خطرہ تھا، اسی دروازے کے باہر مقبرۂ رحمت واقع ہے۔

مقبرۂ رحمت: اس قبرستان میں صحابہ کرام میں سے حضرت شداد بن اوس، حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہما وغیرہ مدفون ہیں۔ یہ قبرستان تدفین کے لیے ہنوز مستعمل ہے۔ اقصیٰ کی یہودی قتل گاہ کے شہدا بھی یہیں مدفون ہیں۔

اسلامی مقبرے: جہاں پرانے زمانے سے بھی لوگ دفن ہوتے آئے ہیں۔

مغربی اور شمالی مسلمان محلے: ان کی بعض عمارتوں پر بہ زور بازو، یہودیوں نے قبضہ کر کے انھیں عبادت خانوں میں تبدیل کر دیا ہے۔

مسجد اقصیٰ کے خلاف کی گئی صہیونیوں کی ظالمانہ کارروائیاں:

۱۳۸۷ھ/ ۱۹۶۷ء کے بعد سے ہی یہودیوں نے مسجد اقصیٰ پر قبضہ کرنے کے لیے اسلامی وضع کو بدلنے کی بہتیری کوششیں کی ہیں۔ جن میں کچھ اس طرح ہیں۔

۱۔ جون ۱۹۶۷ء کو مغاربہ محلے کی مسلمان باشندوں کو یہاں سے چلے جانے اور اپنے مکانات خالی کر دینے کی صرف ۲۴ گھنٹے کی مہلت کے بعد، یہودیوں کی ریاست نے مسجد اقصیٰ کی مغربی دیوار کے پڑوس کے اس محلے کا نام ونشان مٹا دیا۔ ۶۵۰/ عربوں کو ان کے گھروں سے زبردستی بھگا کر انھیں زمین بوس کر دیا گیا، اس محلے کی زمین صلاح الدینؒ نے ان عربوں کے آباواجداد کو دے کر انھیں یہاں بسایا تھا، اس طرح شرف محلے سے بھی ۳ ہزار عربوں کو دربدر کر دیا گیا اور اس کا نام حارۃ الیہود کر دیا گیا۔ مسجد اقصیٰ کی مغربی دیوار پر جو حائط براق کے نام سے جانی جاتی ہے، اس کے بعد ہی قبضہ کر کے زبردستی اس کا نام حائط المبکیٰ (دیوار گریہ) کر دیا اس کے سامنے کے میدان کو بھی انھوں نے خوب کشادہ کر لیا اور اب وہاں پوجا پاٹ کرتے رہتے ہیں۔

۲۔ اسی زمانے میں صہیونی ریاست نے مسجد اقصیٰ کے مغربی گوشے کو ڈھایا جو زاویہ فخریہ کے نام سے معروف تھا، اس کے قریب عربوں کے ۱۴ گھر بھی ڈھا دیے۔

۳۔ ۲۴ جمادی الاخریٰ ۱۳۸۷ھ۔ ۳۱/ ۸/ ۱۹۶۷ء کو صہیونی پولس نے باب مغاربہ کی چابی مسلمانوں سے چھین لی، یہ مسجد اقصیٰ کے دروازوں میں سے مشہور دروازہ تھا۔

۴۔ ۱۳۸۹ھ/ ۱۹۶۹ء میں صہیونیوں نے مسجد اقصیٰ کے صحن کے سامنے کے مدرسہ تنکزیہ پر قبضہ کر لیا، بہانہ یہ تھا کہ دیوار گریہ تک آنے جانے والے یہودیوں کی حفاظت اس کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی مدرسے کے بغل کے ۱۰ گھروں کے ۱۰۵ مکینوں کو ان کے گھروں سے زبردستی نکال دیا۔ یہ مدرسہ اب صہیونی بارڈر سیکورٹی فورسز کا مرکز ہے۔

۵۔ ۱۳۸۹ھ/ ۱۹۶۹ء میں ایک آسٹریلوی یہودی نے مسجد اقصیٰ کے جنوبی حصے کو جلا دیا تھا جس کے دوران صلاح الدین ایوبیؒ کا منبر اور جنوبی دیوار بھی جل گئی تھی، جس میں عہد اموی و عہد عباسی کے مایہ ناز نقش ونگار بنے ہوئے تھے لیکن صہیونی پولس والوں نے اس کو باؤلا شمار کر کے گرفتاری کے بعد فوراً چھوڑ دیا تھا، یہ واقعہ جمعرات ۸/ ۶/ ۱۳۸۹ھ۔ ۲۱/ ۸/ ۱۹۶۹ء کو پیش آیا، دوسرے روز جمعہ کی نماز نہ ہو سکی اس کے بعد والی نماز جمعہ منبر کے بغیر ہوئی۔

۶۔ اسرائیلی سپریم کورٹ نے ۲۳/۹/۱۹۹۳ء (۵/ جمادی الاولی ۱۴۱۴ھ) کو ایسا فیصلہ سنایا، جس کی رو سے حرم قدسی (مسجد اقصیٰ) کی حرمت کو ہر طرح سے پامال کرنے کی صہیونیوں کو کھلی چھوٹ دے دی گئی۔ اس فیصلے کے اہم مندرجات اس طرح تھے۔

(الف) حرم مسجد اقصیٰ ریاست اسرائیل ہی کا رقبہ ہے، لہٰذا اس پر اسرائیلی ریاست کے ہی قوانین و احکام برپا ہوں گے۔ جن میں تعمیری منصوبہ سازی اور آثار قدیمہ کے قوانین بھی داخل ہیں، نیز مقامات مقدسہ تک آزادی کے ساتھ اور بلا روک ٹوک ہر عقیدے کے، حامل کو آنے جانے کی اجازت ہوگی اور کسی کو بھی اس آزادی سے کھلواڑ کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔ عدالت کا مقصد یہ ہے کہ مسجد اقصیٰ کے حرم میں یہودیوں کو بھی عبادت کی اجازت ہونی چاہیے، اور مسلم وزارت اوقاف کو یہاں اصلاح ومرمت اور تعمیر نو کی کوئی اجازت نہیں ملنی چاہیے۔

(ب) اس قرارداد کی رو سے ''جبل ہیکل'' کی صہیونی سکریٹریوں کو حرم قدسی پر سرپرستی کا اختیار دیا گیا۔

(ج) جبل ہیکل یہ بہ قول عدالت ''جبل بیت'' کو یہودیوں کے نزدیک ۳/ ہزار سال سے بڑی دینی اہمیت کا حامل اور مقدس رہا ہے، یہ تقدس ابدی ہے، یہ کسی متعین اقتدار سے ہم رشتہ نہیں، یہ تقدس کسی بھی قانونی بالادستی سے فزوں تر اور برتر ہے۔ حال آں کہ عدالت نے اپنے مذکورہ فیصلے میں یہ بات بھی تسلیم کی ہے، کہ ۱۳سو برس سے یہ جگہ مسلمانوں کے لیے بھی مقدس ہے، نہ صرف یہ بل کہ مسلمانوں کے نزدیک تقدس میں اس کا رتبہ مکہ اور مدینہ کے مابعد ہے۔ بہ ہر کیف اسرائیل کی عدالت عظمیٰ کا عندیہ یہ ہے کہ اس جگہ کی فضیلت مسلمانوں کے نزدیک اتنی نہیں، جتنی یہودیوں کے نزدیک ہے۔

(د) عدالت نے اپنے فیصلے میں اسرائیلی اداروں کو اس بات کا پابند کیا ہے، کہ انھیں اس وقت سے آیندہ ہمیشہ سارے آثار قدیمہ کی زبردست نگرانی کرنی چاہیے، تاکہ اسلامی اوقاف کا ادارہ یہاں کسی طرح کی اصلاح ومرمت اور صورت حال میں من مانی تبدیلی نہ کر سکے۔

۷۔ ۱۳۹۵ھ/۱۹۷۵ء میں ایک صہیونی عدالت نے مسجد اقصیٰ کے صحن میں یہودیوں کے ''نماز'' پڑھنے کی بھی اجازت دے دی تھی اور صہیونی ریاست کو بہ ذریعہ پولس اس کا انتظار کرنے کا پابند بنایا تھا۔

۸۔ مسجد اقصیٰ کے تمام دروازوں پر یہودی پولس کا قبضہ رہتا ہے اور مسجد کی سیکورٹی کی حفاظت کے بہانے، سارے نمازیوں بالخصوص؛ جوانوں کی جامہ تلاشی اور ان کی تذلیل کی جاتی ہے۔

۹۔ مسجد اقصیٰ کے اندر کئی بار صہیونیوں نے خون خرابہ کیا ہے، مشہور قتل عام ۱۲/ ربیع الآخر ۱۴۱۱ھ۔ ۸/۱۰/۱۹۹۰ء کو کیا تھا جس میں ۱۸ نمازی شہید اور سیکڑوں زخمی ہوگئے تھے۔ ۱۳۸۷ھ/۱۹۶۷ء سے ہی صہیونی مسجد اقصیٰ کی اصلاح ومرمت اور وہاں کے گنبدوں، بیلوں اور دیگر آثار کی مرمت و اصلاح کرنے نہیں دیتے، تاکہ یہ علی حالہ رہ کر گر جائیں، جو ان کے اہداف کے عین مطابق ہے۔

شہر قدس کی دیگر آباد مسجدیں:

مسجد مرابطین، مسجد انصار، مسجد دعوت، مسجد مہاجرین، مسجد شیخ محمود، مسجد البلد، مسجد عمری، مسجد کرافان، مسجد ابرار، مسجد حی بشیر، مسجد اموی، مسجد زاویہ قدیمہ، مسجد احمد ساحوری، مسجد بیر ایوب، مسجد عین اللوزہ، مسجد العین، مسجد ابو ہریرہ، مسجد شیخ عبداللہ، مسجد فاروق، مسجد محمد الفاتح، مسجد بلال ابن رباح، مسجد امام شافعی، مسجد شیخ جراح، مسجد عابدین، مسجد حجازی، مسجد ساہرہ، مسجد سلیمان فارسی، مسجد علمی، مسجد عمر بن الخطاب، مسجد خالد ابن ولید، مسجد شہدائے فلسطین، مسجد زاویہ منصورہ، مسجد ثوری، مسجد نور، مسجد ارقم، مسجد بدرالدین لولو، مسجد مصعب بن عمیر، مسجد مولویہ، مسجد شیخ مکی، مسجد شیخ ریحان، مسجد مئذنہ خمراء، مسجد زاویہ نقشبندیہ، مسجد زاویہ افغانیہ، مسجد درغث، مسجد شوربجی، مسجد مصطفیٰ، مسجد ابوبکر صدیق، مسجد عمر بن الخطاب، مسجد محمد قدسی، مسجد شبت، مسجد رزاق، مسجد خانقاہ صالحیہ، مسجد قلاوون، مسجد قمری، مسجد حمزۃ بن عبدالمطلب، مسجد عمری صغیر، مسجد عثمان بن عفان، مسجد عمری کبیر، مسجد دیسی، مسجد القلعہ، مسجد محارب، مسجد سلطان ظاہر برقوق، مسجد شرفاء، مسجد سیوفی، مسجد یعقوبی، مسجد سعد وسعید، مسجد ادہمی، مسجد سیدہ بدریہ، مسجد علی بن ابی طالب، مسجد سلطان ابراہیم ادہمی، مسجد بدر، مسجد عبدالحمید شومان، مسجد کلیۃ الدعوۃ، مسجد احباب اللہ، مسجد نور، مسجد اتقیاء، مسجد بشیر، مسجد عبد بن رواحہ، مسجد فاروق، مسجد عیسویہ، مسجد احد، مسجد ابوعبیدہ بن جراح، مسجد خلافۃ اسلامیہ۔

شہر قدس میں مدفون بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم: ☆عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ (۳۸ ق ھ/ ۶۴۴ء۔ ۳۴ھ/ ۵۸۶ء) ☆ابو ریحان ☆ابراہیم بن ابی عبلہ عقیلی مقدسی رضی اللہ عنہ متوفی ۵۲ھ/ ۶۷۲ء ☆فیروز دیلمی رضی اللہ عنہ، متوفی ۵۳ھ/ ۶۷۳ء بہ عہد سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ☆شداد بن اوس رضی اللہ عنہ، متوفی ۵۸ھ/ ۶۷۷ء بہ عہد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ☆ذوالاصابع تمیمی رضی اللہ عنہ ☆مسعود بن اوس بن زید رضی اللہ عنہ ☆واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ ☆ابوابی بن ام حرام رضی اللہ عنہ ☆یزید بن سلام رضی اللہ عنہ ☆عبداللہ بن محیریز جمحی رضی اللہ عنہ متوفی ۹۹ھ/ ۷۱۷ء ☆زیاد بن ابی سودہ رضی اللہ عنہ

شہر قدس کے اہم مقبرے: مقبرۂ رحمت، مقبرۂ یوسفیہ، مقبرۂ باب الساہرہ، مقبرۂ ماٌمن اللہ، مقبرۂ صور باہر، مقبرۂ بیت صفافا، مقبرۂ ام طوبا، مقبرۂ جبل المکبر، مقبرۂ طور، مقبرۂ شرفات، مقبرۂ شعفاط، مقبرۂ کفر عقب، مقبرۂ مالحہ، مقبرۂ عین کارم، مقبرۂ دیر یاسین۔

شہر قدس کے اہم بازار: سوق علون، سوق بازار، سوق حصر، سوق لحامین، سوق نحاسین، سوق عطارین، سوق باشورہ، سوق صیاغ/ تاجر، سوق یہود، سوق باب سلسلہ، سوق قطانین، سوق باب الزیت، سوق باب عامود، سوق باب حطہ، سوق حارۂ نصاریٰ۔

جامعہ کے شب وروز

فروعاتِ جامعہ اکل کوا میں ششماہی امتحانات اور اس کی کیفیات:

الحمدللہ جامعہ اکل کوا کے تحت چلنے والے مراکز کی تعداد ۹۶/ ہیں، جس میں ۶۹/ بنین ہیں اور ۲۷/ بنات ہیں۔ جس میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ وطالبات کی کل تعداد: ۲۶۷۵۵ ہے ۱۸۱۳۵/ بنین اور ۸۶۲۰/ بنات ہیں۔

امسال فروعاتِ جامعہ سے ناظرہ قرآن کریم مکمل کرنے والے طلبہ کی مجموعی تعداد: ۶۷۸۲/ ہے جس میں الحمدللہ ۱۳۰۶/ بنات ہیں اور ۵۴۷۶/ بنین ہیں، اسی طرح بفضلہٖ تعالیٰ امسال مراکز جامعہ سے حفظ مکمل کرنے والے طلبہ کی تعداد ۴۰۷/ رہے۔

جامعہ اپنی تمام فروعات کی تعلیم وتربیت کی مکمل نگرانی اور فکر کرتا ہے، اس سلسلہ میں سال میں دو دفعہ جامعہ کے اساتذہ کرام کی ایک بڑی جماعت تعلیمی وتربیتی جائزے کے لیے تمام مراکز کا رخ کرتی ہے اور مکمل کیفیت نوٹ کر کے ذمہ داران اور رئیس الجامعہ تک پہنچائی جاتی ہے۔ اسی سلسلہ میں گذشتہ ماہ ششماہی امتحانات کے موقع پر جامعہ کے ۱۰/ وفود پر مشتمل تقریباً ۸۰/ اساتذہ کرام مختلف صوبوں کے مراکز جامعہ میں تعلیمی جائزے اور امتحاناتِ ششماہی کے لیے پہنچے اور الحمدللہ ہدایاتِ رئیس الجامعہ کے مطابق امتحانات کے بعد مطلوبہ معیار میں جو کمی پائی گئی ہر مرکز میں ناظمِ مرکز اور تمام اساتذہ کی موجودگی میں اس کی نشاندہی کی گئی اور تلافی کی صورت بھی بتائی گئی، تاہم مجموعی نتائج وکیفیت نہایت عمدہ رہے، نیز تعلیم کے علاوہ نظامِ صفائی، نظامِ مطبخ اور نظامِ تربیت کا بھی جائزہ لیا گیا، جو قابلِ تحسین ہے۔

رئیس الجامعہ کے حکم کے مطابق سالانہ امتحانات کے موقع پر بھی انہی اساتذہ کو ان مراکز میں بھیجنے کا مکلف کیا گیا ہے، جنہوں نے ششماہی میں جائزہ لیا تاکہ سالانہ میں اس بات کو خصوصاً نوٹ کریں کہ جو کمی تھی اس کی تلافی ہوئی یا نہیں۔

مدرسۃ البنات سے امسال مومنہ کورس مکمل کرنے والی طالبات کی تعداد ۱۳۰۶/ ہیں جو ناظرہ قرآن مجید کے علاوہ ضروریاتِ دین اور ہنرمندی کورس مثلاً سلائی مشین، مہندی ڈیزائنگ، ایمبرائڈری کورس مکمل کر رہی ہیں۔ الحمدللہ ہر سال فارغ ہونے والی بچیوں کو جامعہ اور مخیّرین حضرات کی طرف سے سلائی مشین، قرآن شریف، اور بہت ساری کتابیں دی جاتی ہیں۔

الغرض جامعہ اپنے مراکز کی تعلیم وتربیت کے لیے ہر اعتبار سے کوشاں رہتا ہے اور اس میں بہتری کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔

مرکز اسلامی منہاج العلوم رنجنی میں تکمیلِ حفظِ قرآن کی نورانی مجلس:

۸؍جنوری ۲۰۱۸ء بروز پیر جامعہ اکل کوا کی قدیم ترین شاخ مرکز اسلامی منہاج العلوم رنجنی میں صبح ۱۰ بجے تکمیل حفظ قرآن کی مجلس منعقد ہوئی؛ جس میں ۲۵؍خوش نصیب طلبہ تکمیلِ حفظ قرآن کی دولت سے مالا مال ہوئے۔

اس نورانی مجلس میں بہ طور مہمان خصوصی؛ نائب رئیس الجامعہ جناب حافظ محمد اسحاق صاحب وستانوی دامت برکاتہم، حاجی ابراہیم ملاّ صاحب (ساؤتھ افریقہ) مولانا نعیم صاحب (ناظم رنجنی) مولانا عبد الرحمن صاحب (ناظم جعفر آباد) ماسٹر الیاس پٹیل صاحب (اکل کوا) موجود تھے۔

اس کے علاوہ حفاظ کرام کے والدین اور رشتہ دار بھی شریکِ مجلس رہے۔

نائب رئیس جامعہ کی مختصر نصیحت اور دعا پر مجلس کا اختتام عمل میں آیا۔

مدرسہ تعلیم القرآن نمبائتی ضلع اورنگ آباد، میں مجلسِ تکمیل حفظِ قرآن کریم:

۹؍جنوری ۲۰۱۸ء بروز منگل جامعہ اکل کوا مرا ٹھواڑہ کی قدیم ترین شاخ "مدرسہ تعلیم القرآن نمبائتی" اورنگ آباد میں بعد نمازِ مغرب تکمیلِ حفظ قرآن کی مجلس منعقد کی گئی، جس میں ۵؍خوش نصیب طلبہ نے حفظِ قرآن کی انمول دولت حاصل کی، ان میں سے ۴؍طلبہ صرف تڑوی برادری کے تھے۔

اس بابرکت مجلس میں مہمانِ خصوصی کے طور پر نائب رئیس الجامعہ جناب حافظ محمد اسحاق وستانوی کے ساتھ؛ وہ تمام ہی حضرات شامل تھے، جو کہ منہاج العلوم رنجنی کے پروگرام میں شریک رہے؛ علاوہ ازیں بھی حفاظِ کرام کے والدین اور دیگر رشتہ دار بھی اس مجلس انبساط میں مدعو تھے۔ حضرت نائب رئیس جامعہ کے مختصر خطاب اور دعا کے ساتھ مجلس اختتام پذیر ہوئی۔

بہار سیلاب زدگان کو از جانبِ جامعہ سردی کا تحفہ:

بہار کے تباہ کن سیلاب کی خبر سنتے ہی اہل جامعہ متاثرین سیلاب کی تمام ضروریات کی تکمیل کے لیے مکمل طور سے کوشاں ہو گئے تھے؛ جیسا کہ اس سے پہلے کی خبر میں قارئین نے پڑھا ہوگا۔

اس وقت لوگوں کو غلے، دوائیاں اور پوشاک کی اشد ضرورت تھی، جسے حقدار و مستحقین تک پہنچایا گیا؛ لیکن جائزہ لینے والی ٹیم نے اُسی وقت اندازہ لگا لیا تھا کہ موسمِ سرما آنے آنے کو ہے، اور سرما کا قہر اس بے سرو سامانی کے عالم میں ان پر مزید قہر بن کر ٹوٹے گا۔

اس لیے فوری طور پر ان کے لیے گرم پوشاک اور کمبلوں کا انتظام کیا جائے؛ چناں چہ جامعہ نے ہزاروں کمبل اور لاکھوں پوشاک کا انتظام کیا اور اپنے عملے کو بھیج کر بروقت انھیں سردی سے بچنے کا سامان مہیا کیا۔

یہ تقسیمی کارروائی دسمبر کی ۴ تاریخ کو ارریہ پورنیہ کے ۱۴ گاؤں میں بحسن وخوبی عمل میں آئی۔

جامعہ مزید ان کی ضروریات کی تکمیل کے لیے کوشاں ہے۔

اللہ تمام حضراتِ اہلِ خیر کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ اور بہار کے سیلاب زدگان کی اپنی قدرت سے مدد فرمائے۔

انتقال پر ملال:

جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا کے شعبۂ حفظ کے قدیم استاذ مولانا عبدالرحمٰن صاحب بستوی کے والد محترم مولانا فاروق صاحب بستویؒ ۲۵/ جنوری ۲۰۱۸ء بروز جمعرات عصر کی نماز سے کچھ پہلے، اپنے مولائے حقیقی سے جا ملے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون! مرحوم کئی معنوں کر بڑے ذی مرتبت آدمی تھے، جہاں آپ کو حضرت مدنی کے شاگرد ہونے کا شرف حاصل تھا، وہیں آپ کو نصف صدی سے زائد محی السنۃ حضرت ہردوئی کی صحبت حاصل تھی، آپ بڑے ہی پابندِ معمولات وسنت بزرگ تھے۔

نمازِ جنازہ ۲۶/ جنوری بروز جمعہ تقریباً ۱۰/ بجے احاطۂ جامعہ میں کثیر طلبہ واساتذہ کی موجودگی میں ادا کی گئی، اور اکل کوا کے قبرستان میں ہی تدفین عمل میں آئی۔

اسی طرح شعبۂ عالمیت کے استاذ مجلۂ ہٰذا کے ایک خاص فرد مولانا محمد سبحان ارریاوی کی خوش دامن صاحبہ (ساس) ۱۵/ جنوری ۲۰۱۸ء بروز پیر بوقت ۱۲/ بجے رات اس دارِ فانی کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے اللہ کی رحمت میں پہنچ گئیں، اناللہ وانا الیہ راجعون!

مرحومہ بڑی متبع شریعت، نیک سیرت، خوش اخلاق وخوش اطوار، خوش مزاج اور مہمان نواز خاتون تھیں۔

۱۶/ جنوری ۲۰۱۸ بعدِ نمازِ عصر نمازِ جنازہ کی ادائیگی کے بعد ان کے آبائی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

اللہ تعالیٰ مرحومین کی بال بال مغفرت فرما کر کروٹ کروٹ جنت الفردوس نصیب کرے اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین!

قارئین شاہراہ سے ایصالِ ثواب اور دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

جامعہ کے وسیع وعریض میدان میں تاریخی یوم جمہوریت

آزاد ہندوستان کی تاریخ میں تین دن انتہائی اہمیت کے حامل شمار کیے جاتے ہیں، ۲۶ر جنوری، ۱۵ر اگست اور گاندھی جینتی۔

۱۵ر اگست میں ملک انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوا۔ ۲۶ر جنوری میں ملک جمہوری ہوا، یعنی اپنے ملک میں اپنا قانون نافذ ہوا۔

اس اہم اور تاریخی موقع پر ہندوستان کے تمام تعلیمی، سرکاری ادارے یوم جمہوریہ کا پورے اہتمام اور تاریخی حیثیت سے جشن مناتے ہیں۔

جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا، مہاراشٹر- (جو ایک عظیم مرکزی عالمی مردم ساز ادارہ ہے-) میں بھی پورے اہتمام سے یہ دن منایا جاتا ہے اور ہر سال کی طرح امسال بھی رئیس جامعہ کے ایما پر ناظم تعلیمات، معتمد جامعہ حضرت مولانا حذیفہ صاحب وستانوی نے اہم سرکاری، سماجی شخصیات کو اس پروگرام میں شرکت کی دعوت دی، جس کو مہمانوں نے شرف قبولیت سے نوازا۔

ان سرکردہ شخصیات میں دہلی سے تعلق رکھنے والے جناب ارتضیٰ کریم جو مجلس قومی برائے فروغ اردو زبان کے چیرمین ہیں، شخصی طور پر حاضر ہوئے؛ ساتھ ہی نندوربار ضلع کمشنر جناب سدھیر والگلے صاحب، اکل کوا شہر کے P.S.I اور دیگر حکومتی ذمہ داران بھی محفل کی زینت بنے۔ تلاوتِ کلام پاک سے محفل کا آغاز ہوا، چند طلبہ نے انگریزی، اردو اور مراٹھی میں تقاریر پیش کیں، وطنی ترانے پڑھے گئے۔ مہمانوں کے تاثرات سے پہلے جامعہ کے ناظم تعلیمات جناب مولانا حذیفہ صاحب وستانوی نے انتہائی مختصر مگر جامع تاثر پیش کیا، جس میں آں جناب نے جمہوریت کی حقیقت واضح کی اور دور حاضر میں اس کی ضرورت کی طرف عوام کو متوجہ کیا۔ اس کے بعد جناب والگلے صاحب نے قانونی اعتبار سے جمہوریت کی حقیقت واضح کی، موصوف کے بعد جناب ارتضیٰ کریم صاحب نے بہت ہی اچھوتے اور نرالے انداز میں جمہوریت کو واضح کیا، طلبہ کو کچھ بننے اور تاریخی کارنامہ انجام دینے کی طرف توجہ دلائی کہ سب مولانا غلام محمد صاحب وستانوی جیسی شخصیت بن کر دنیا میں چھا جائیں، اور اپنی خودی کا سودا نہ کرتے ہوئے دینی، ملی، سماجی کام کریں۔

اخیر میں حضرت رئیس جامعہ نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا، آپ نے حسن تعلیم اور اس کی پختگی کی طرف متوجہ کیا، اور طلبہ کو محنت پر خوب ابھارا، حضرت کی دعا کے ساتھ تاریخی اجلاس کا اختتام عمل میں آیا۔

از قلم: (حضرت مولانا) عبدالرحمٰن صاحب ملی ندوی